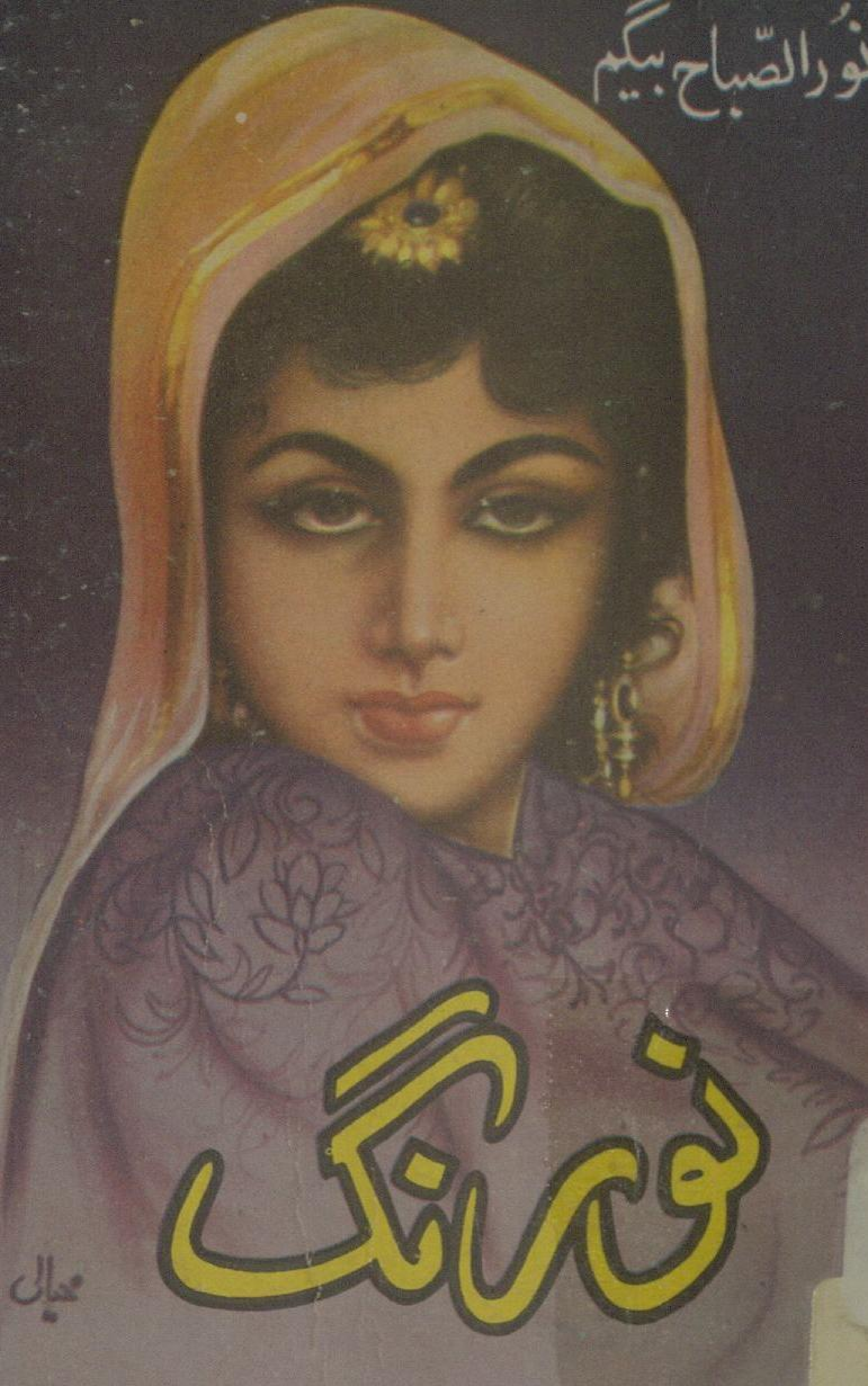

نورالصباح بیگم
نورنگ

ناول

نورنگ

نور الصباح بیگم

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ❊ حیدرآباد ❊ کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت : Rs 15.0.

مقام اشاعت :
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی
لاہور

معنون

میری بہو زلیخا تسنیم کے نام

کالج کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔
موسم خوش گوار تھا۔
شہناز بار بار ماں سے کہہ رہی تھی کہ
"پکنک کے لیے ہاکس بے جایا جائے۔"
اتوار کے روز صبح صبح ہی سرخ رنگ کی شیورلٹ میں بیٹھ کر پورا خاندان ہاکس بے روانہ ہو گیا۔ کھانے پینے کا سامان اور چائے وغیرہ ساتھ لے لیا تھا۔
شہناز سیکنڈ ایئر میں پڑھتی تھی۔ وہ ذکی صاحب کی اکلوتی بیٹی تھی اور ماں باپ کو بہت ہی پیاری تھی۔ سفید رنگ، ناک نقشہ اچھا خاصا مگر قد چھوٹا۔
شہناز کی ساتھی لڑکی نورنگ اس کی ہم عمر تھی۔ سرخ و سفید رنگ، پتلی سی ناک، بڑی بڑی حسین آنکھیں، گلابی ہونٹ، قد میں شہناز سے کافی اونچی اور سڈول جسم — بظاہر وہ شہناز سے شکل کے اعتبار سے ممتاز تھی مگر پاکستان اور ہندوستان کی سترہ روزہ جنگ کے ہنگامے میں یہ لڑکی بیگم ذکی کو لاہور کے کسی کیمپ سے مل گئی تھی۔ ان کی بہن نے یہ لڑکی لاہور سے لا کر ان کو دے دی تھی۔ وہ خود رکھنا نہ چاہتی تھیں کیوں کہ ان کے گھر میں ان کا لڑکا حامد جوان تھا۔ وہ ہر وقت خاموش اور غم زدہ سی رہتی تھی۔ اس کو اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کا کوئی پتہ ہی نہ تھا۔ اس کا پورا گاؤں نیست و نابود ہو چکا تھا۔ ہندوستانی گولوں کی زد سے بچ کر وہ خود کسی نہ کسی طرح گاؤں کے بچے ہوئے کچھ لوگوں کے ہمراہ لاہور پہنچ گئی تھی۔

زینب بیگم (بیگم ذکی) نے اس کو یہ کہہ کر رکھ لیا تھا کہ وہ بیٹی کی طرح رکھیں گی اور دیکھ بھال کر کسی اچھی جگہ شادی کر دیں گی۔ ان کو دکھ تھا کہ شہناز تنہا ہے اگر یہ لڑکی گھر میں رہی تو شہناز کو بھی ایک ساتھی مل جائے گی۔

شہناز نورنگ کے آجانے سے بہت خوش تھی۔ دونوں بہنوں کی طرح رہتی تھیں۔ عمدہ کھانا پکانا، سلائی، بنائی سب کچھ اسے آتا تھا مگر پڑھنے میں وہ صرف تھوڑی اردو لکھ پڑھ سکتی تھی۔

نورنگ کی آواز بہت اچھی تھی۔ گاؤں کے گیت اور چند غزلیں اس کو یاد تھیں اس نے اپنے خاندان کے متعلق یہ بتایا تھا کہ اس کے والد گاؤں کے باحیثیت لوگوں میں سے تھے مگر وہ اس کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور اب وہ گاؤں میں اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لاہور میں کسی جگہ اس کے رشتے کے ایک ماموں کا گھر تھا مگر ان کا پتہ اس کو نہیں معلوم تھا۔

سامنے دور تک نیلا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ حدِّ نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ شہناز اور نورنگ زینب بیگم سے اجازت لے کر باہر نکل آئیں اور ہٹ سے ذرا دور سمندر کے قریب پتھروں پر بیٹھ گئیں۔

شہناز نے نورنگ سے گانے کی فرمائش کر دی۔

نورنگ اگرچہ رنجیدہ اور کھچی کھچی رہتی تھی مگر زینب بیگم اور شہناز کا پیار اس کو ان کی ہر بات ماننے پر مجبور کر دیتا تھا۔

پہلے تو شہناز کے کہنے پر اس نے گرد و پیش نظر ڈالی اور پھر جب دیکھا کہ کوئی آدمی قریب نہیں ہے تو سمندر اور چٹانوں کی تنہائی میں گنگنانا شروع کیا اور پھر یہ غزل قدرے آہستہ آواز سے گانے لگی۔

اس کی آواز بے حد سُریلی تھی :

غزل :

گئے چمن میں تو گلشن کچھ آشنا بھی نہیں
گلوں سے خار ہیں بہتر کہ ہم نوا بھی نہیں
چھٹا ہے ساتھ مرا قافلے سے کچھ ایسا
کہ گردِ کارواں تو کدھر، اب تو نقشِ پا بھی نہیں
وہ اب بھی گزری بہاروں کا ذکر کرتے ہیں
جو گل کے حسنِ تبسّم سے آشنا بھی نہیں
بھٹکتے راہی نے منزل کو پا لیا آخر
تھکا ہوا بھی، لیکن شکستہ پا بھی نہیں
یہ نورؔ کیسا جہاں ہے جہاں کہ دوست نہیں
ہمیں اب اپنے مقدّر سے کچھ گلہ بھی نہیں

قریب ہی دوسرے ہٹ میں کوئی اور خاندان ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے دو تین لڑکے پتلون اور بنیان پہنے دو لڑکیوں کو ساتھ لیے نکلے اور سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے آگے نکل گئے۔ یہ لڑکیاں جین اور بلاؤز پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں لڑکیاں اور دو لڑکے تو پتلونیں اتار کر سوئمنگ کاسٹیوم میں سمندر میں اتر گئے مگر تیسرا لڑکا جو گورا چٹّا تھا واپس لوٹا، دُور کھڑے ہو کر ان دونوں لڑکیوں پر ایک نظر ڈالی، اور واپس اپنی ہٹ کے اندر چلا گیا۔

ان دونوں خاندانوں کی گاڑیاں ہٹ کے پشت کی طرف کھڑی تھیں ان کے ڈرائیور ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے اور سگریٹیں پی رہے تھے۔

شام تک پکنک جاری رہی۔

دوپہر کو سب نے ناشتے دان کھولے اور کھانا کھایا۔

شام کے قریب ذکی صاحب نے کہا :

" بیگم شام ہو رہی ہے جلدی سے چائے کا دور ہو جائے تو واپس چلیں ۔"

نورنگ نے چائے سب کو تھرماس ہیں سے نکال کر دے دی ۔
بسکٹ کا ڈبّا کھول کر رکھ دیا ۔
چائے پی کر سامان باندھا ۔
اور سب گھر کو واپس ہو گئے ۔

سعادت صاحب کافی متمول آدمی تھے۔

لاہور سے کراچی وہ ملازمت کے سلسلے میں آئے تھے۔ اور اب کراچی ہی میں ہاؤسنگ سوسائٹی میں اپنی کوٹھی تعمیر کرا کر رہنے لگے تھے۔ ان کی کوٹھی جدید فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھی اور بالکل جدید طرز سے ڈیکوریٹ کی گئی تھی۔ ان کی بیٹی شبنم سینٹ جوزفس کالج سے بی اے کر رہی تھی۔ ان کی بیوی جہاں آرا آزاد خیال خواتین میں سے تھیں۔ ان کا بیٹا منوّر پاک فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔

اتفاق سے لڑائی کے بعد منوّر چھٹیوں میں کراچی آیا ہوا تھا اس نے پاکستان اور بھارت کی سترّہ روزہ جنگ میں سیالکوٹ کے محاذ پر پورا پورا حصہ لیا تھا۔ اب حالات بہتر دیکھ کر افسروں کو ہفتے ہفتے بھر کی رخصت دی جا رہی تھی۔

شبنم نے بھائی کی آمد پر پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ اپنی دوست خالدہ کو بھائی سے ملانا چاہتی تھی۔ خالدہ اس کو بے حد پسند تھی۔ دونوں کو بے تکلف بنانے کی ایک ہی صورت تھی کہ پکنک پر جایا جائے مگر نہ معلوم کیوں لڑائی کے بعد منوّر وہ منوّر نہ رہا تھا جس میں بچپن تھا بلکہ وہ کافی بُردبار بن چکا تھا۔ بہن کی خوشی کی خاطر اس نے تفریح میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے دوست راحت اور انور کو جس سے شبنم کی بات چیت چل رہی تھی، دونوں کو ساتھ لے لیا تھا۔

راحت بہت زندہ دل آدمی اور ہنسی خوشی رہنے والا مرنجاں مرنج شخص تھا اور اس سے منوّر کے گھر کے سب لوگ خوش اور بے تکلّف تھے۔

خالدہ سینٹ جوزفس کالج کی ان آزاد لڑکیوں میں تھی جنھوں نے والدین کے ہمراہ لندن وغیرہ کا ایک آدھ چکّر لگا لیا تھا اور وہاں سے مغربی تہذیب کی دل دادہ بن کر لوٹی تھیں۔

انور اس کے مذاق کے مطابق تھا۔

منوّر کچھ تو شکل وصورت سے ہی سرحدی پٹھان معلوم ہوتا تھا۔ کچھ فوج میں رہ کر اس کا جسم بے حد خوب صورت نکل آیا تھا اور اس لڑائی کے بعد تو اس میں کچھ اور ہی شان پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے اگرچہ آزاد گھر کی آزاد فضا میں پرورش پائی تھی مگر نہ معلوم کیوں اس کو شبنم کی بڑھتی ہوئی آزادروی اور دوستیاں پسند نہ تھیں۔ شبنم اکثر اس کی شادی کے لیے اپنے کالج کی لڑکیاں بتاتی رہتی مگر وہ جب اُتا ٹال دیتا۔ اور کہہ دیتا کہ جب تک وہ کیپٹن نہ ہو جائے فوج کے قواعد کے مطابق شادی نہیں ہو سکتی۔

کچھ دنوں سے سعادت صاحب کی ایک رشتے کی بہن ہنگاموں سے بچ کر کسی نہ کسی طرح لاہور اور وہاں سے کراچی پہنچ گئی تھیں جو ادھر ہی کسی گاؤں میں رہا کرتی تھیں۔

وہ بیوہ تھیں۔

اس لڑائی نے ان سے ان کا بچّہ، جوان لڑکی اور گھر چھین لیا تھا۔ اب تو وہ رو دھو کر چپ ہو چکی تھیں۔

ان کا نام خدیجہ بیگم تھا۔

ان کو گھر پر چھوڑ کر یہ لوگ پکنک پر آگئے تھے۔

جو تین لڑکے برابر کی ہٹ میں سے نکل کر آئے تھے وہ یہ ہی تینوں لڑکے منوّر، انور اور راحت تھے۔

واپسی پر راستے میں شبنم بولی :

" امی نہ معلوم یہ لوگ کون تھے جو برابر والے ہٹ میں ٹھہرے تھے۔"

بیگم سعادت نے جواب دیا :

" میں تو پہچانی نہیں کوئی بڑا نظر آتا تو شاید پہچان لیتی۔ مجھے تو صرف دو لڑکیاں نظر آئیں "

ڈرائیور نے آہستہ سے کہا :

" ذکی صاحب کے گھر کے لوگ تھے۔"

سعادت صاحب بولے :

" وہ ذکی صاحب جو دلّی کے رہنے والے ہیں اور ناظم آباد میں رہتے ہیں نا۔"

ڈرائیور بولا :

" جی ہاں۔"

منوّر نے کہا :

" تو یہ ان لوگوں کا خاندان تھا۔ امّی کیا ان سے آپ کا میل جول ہے ؟"

بیگم سعادت نے جواب دیا :

" نہیں بیٹے میں تو صرف نام جانتی ہوں۔"

موٹر گھر پہنچی۔

خدیجہ بیگم منتظر تھیں۔

ان کا اس دنیا میں اب تھا ہی کون ان دونوں بچوں کے سوا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے شبنم کو پیار کیا۔

منوّر کو پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔

راحت بولا :

"پھوپھی جان ہماری جان کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچا ہوں اور آپ منوّر کو پیار کر رہی ہیں۔"

خدیجہ بیگم بولیں :

"اے میں نے کب تم میں اور منوّر میں فرق سمجھا ہے۔"

اور انھوں نے راحت کی بھی پیٹھ ٹھونکی :

"اب تو تم لوگ ہی میرے لیے سب کچھ ہو۔"

انھوں نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھے۔ راحت نے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

اور بولا :

"پھوپھی — میری پھوپھی جان پیار کر لیجیے۔"

خدیجہ بیگم مسکرا کر بولیں :

"اے ہٹ بھی توبہ توبہ۔ اتنا بڑا ہو کر پیار کراتا ہے۔"

خدیجہ بیگم یہ کہتی ہوئی ایک طرف چلی گئیں۔ اگرچہ وہ بے حد غم زدہ تھیں مگر اس گھر میں آ کر ان کا غم بہت کچھ کم ہو گیا تھا۔ کیوں کہ سعادت صاحب بہت خیال کرتے تھے اور بیگم سعادت نے جب دیکھا کہ خدیجہ بیگم نے ان کے گھر کا پورا انتظام سنبھال لیا ہے تو وہ بھی ان کا خیال کرنے لگیں۔

راحت جب کبھی آ جاتا ان سے ضرور باتیں کرتا اور ان کو ہنسانے کی کوشش کرتا۔ ویسے شبنم کی وجہ سے اس گھر میں گہما گہمی رہتی۔

منوّر تو کراچی سے باہر ہی تھا اور اس لڑائی کے دوران تو اس کی وجہ سے پورا گھر ہی پریشان رہا تھا۔ کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس جگہ ہے اور اس

کی رجمنٹ کہاں تعینات کی گئی ہے۔

لڑائی کے بارہ روز جب گزر گئے تو دو لائن کا ایک خط آیا جس سے معلوم ہو گیا کہ منوّر زندہ ہے۔

اتنے دن تو شبنم بھی خاموش رہی۔ بھائی کی فکر نے اس کے دل کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ ورنہ وہ تو خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ اس کی کوئی شام بیکار نہیں گزرتی تھی اکثر تو شام کو وہ گھر سے باہر ہی رہتی تھی اور اگر کبھی گھر پر رہتی تو چند سہیلیاں چند لڑکے مدعو ہوتے۔

اور —

کبھی ٹوئیسٹ ہوتا۔

یا —

انگریزی موسیقی کی محفل جم جاتی۔

اس کی ان باتوں سے ماں بے حد خوش ہوتیں۔

کئی لڑکے شبنم کے سلسلے میں امیدوار تھے مگر بیگم سعادت کو انور زیادہ پسند تھا۔

❋

منوّر اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔
آج خلافِ معمول وہ کہیں گیا بھی نہیں۔ سرخ پھولوں کے بادامی پردے کمرے کی کھڑکیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ بستر پر بھی اسی رنگ کا پلنگ پوش بچھا ہوا تھا۔ ادھر ادھر منور کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ بے خیالی میں اس نے ایک کتاب اٹھالی مگر وہ صرف ورق گردانی کر رہا تھا نظریں دور دیوار پر جمی ہوئی تھیں کہ راحت کمرے میں داخل ہوا :

راحت : اوہو تم تو مراقبے میں بیٹھے ہو۔ کیا قصّہ ہے۔ کس سوچ میں ہو ؟

منوّر : کچھ نہیں راحت یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کل والی لڑکیاں کون تھیں۔

راحت : اچھا تو یہ کہیے تیرِ نظر کے گھائل ہو چکے ہو۔ اسی غم میں سوگوار بیٹھے ہو۔ مگر یار تم تو فوجی آدمی ہو تمھارا دل اتنا کمزور کیوں ہے ؟

منوّر : نہ میں سوگوار ہوں نہ تیرِ نظر کا گھائل ہوں۔ فوجی ہو یا سویلین اچھی چیز سب کو ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ایک لڑکی ان دونوں میں کافی اچھی تھی نا۔

راحت : تو یہ کیا ہے کہ جان نہ پہچان خالہ بڑی سلام۔ نہ معلوم کون

تھیں۔ پتہ نہ نشان۔

منوّر : مذاق چھوڑو یار سنجیدگی سے سنو۔ ہمارا ڈرائیور بتا رہا تھا کہ دہلی کے کوئی ذکی صاحب ہیں ان کا خاندان تھا اور ناظم آباد میں رہتے ہیں۔

راحت : تو یار مشکل کیا ہے۔ ناظم آباد میں تو ان کو سب ہی جانتے ہیں کل ہی پتہ لگا کر تم کو بتا دوں گا مگر یہ تو بتاؤ کون سی لڑکی کی بات کرتے ہو۔ دو لڑکیاں تھیں ایک ٹھگنی ایک لمبی

منوّر : وہ ہی یار جو لانبے قد کی اور خوش نما رنگ کی تھی۔ سیدھی سی چوٹی گوندھے ہوئے تھی۔

راحت : (چٹکی بجا کر)

کل ہی لو سب کچھ معلوم کر لوں گا ادھر ان کے قریب ہی ایک میرا جاننے والا لڑکا رہتا ہے۔

راحت کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر کے چلا گیا۔

راحت خود ناظم آباد ہی میں رہتا تھا وہ اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا ایک بڑی بہن تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔

شبنم آجکل مشرقی رقص کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی اور اب وہ کافی سیکھ چکی تھی۔ ویسے تو وہ مغربی رقص کی محفلیں منعقد کرتی ہی رہتی تھی مگر ایک تو بھائی کی آمد اور دوسرے اس کی اپنی سالگرہ قریب۔ اس کے علاوہ جو پیغام آ رہے تھے ان سب لڑکوں کو بھی کسی بہانے بلانا ہی تھا اس لیے دو روز بعد بیگم سعادت نے شبنم کی سالگرہ کر کے اس کی سہیلیوں اور ان سب لڑکوں کو بلا لیا جن کا پیغام تھا اسی سلسلہ میں راحت اور خالدہ بھی مدعو تھے۔ لان پر محفل تھی۔ چاروں طرف درختوں پر

سرخ سبز اودے برقی بلب لگا کر شامیانہ لگایا گیا تھا۔ ایک طرف نشست کے لیے صوفے پڑے تھے دوسری طرف انواع و اقسام کے کھانے پینے کی اشیاء میز پر چنی ہوئی تھیں۔

کھانے پینے کا سلسلہ جب ختم ہو گیا تو باری باری سے مہمانوں میں سے چند لڑکے لڑکیوں نے گانا سنایا اور آخر میں خود شبنم سے رقص کی فرمائش کی گئی۔

شبنم تو پہلے ہی سے منتظر تھی کہ ایسا موقع ملے جو وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر سکے۔ شبنم نے اپنا حسین رقص شروع کیا مہمان سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے منور نے آہستہ سے راحت سے کہا:

"راحت تم بڑے جھوٹے ہو کہہ کر گئے تھے کہ کل بتاؤں گا اور پھر لوٹے نہیں میں انتظار ہی کرتا رہا۔ اب تو بتاؤ کچھ معلومات کی بھی تم نے۔"

راحت نے آہستہ سے کہا:

"معلومات تو کر لی مگر بڑی غلط خبر معلوم ہوئی ہے بیٹا۔ چھوٹے قد کی لڑکی تو ذکی صاحب کی اپنی بیٹی ہے جس کا نام شہناز ہے مگر دوسری خوب صورت لڑکی اسی جنگ کی پیداوار ہے۔ اس لڑکی کا نام نورنگ ہے۔ اس کے والدین کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ یہ لڑکی لاہور سے ان کو ملی ہے۔ کم حیثیت قسم کی لڑکی ہے۔"

منور نے کہا:

"تو اس سے کیا ہوتا ہے بھائی۔ شادی انسان کو ایک ہی بار کرنا ہوتی ہے اور وہ اپنی پسند کی لڑکی سے ہی کرنا چاہیے۔ مجھے تو اتنی

بڑی عمر میں یہ لڑکی تمیز کی نظر آئی ہے۔"

راحت نے کہا :

"اوہو تو تم نے یہ بھی طے کر لیا ہے معاملہ اتنا بڑھ چکا ہے حالات خطرناک ہیں۔"

منوّر بولا :

"کیوں نہیں مجھے پسند ہے وہ لڑکی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کیا وہ لڑکی کسی کالج میں پڑھتی ہے۔"

راحت نے جواب دیا :

"نہیں بھئی پڑھتی تو شہناز ہے وہ بے چاری تو گھر میں رہتی ہے۔"

منوّر نے کہا :

"پھر کیا کیا جائے جانے سے قبل ایک بار اس سے مل لیتا۔ تم ہی کچھ ترکیب کرو راحت۔"

راحت بولا :

"میں کیا ترکیب کروں کہیں اتفاقیہ ملاقات ہو جائے تو دوسری بات ہے ویسے تو کوئی ترکیب نہیں ہے وہ زیادہ تر گھر کا کام کاج دیکھتی ہے مگر سنا ہے کہ بڑی شریف لڑکی ہے۔"

منوّر نے کہا :

"مگر بغیر کسی تعارف کے بات ہو بھی تو کیسے ہو۔ فرض کرو مل گئی کہیں۔

راحت نے کہا :

"ہاں یہی تو ہے ان لڑکیوں سے بات کرتے بھی ڈر لگتا ہے بھیّا! یہ حسن والے بڑے قیامت کے ہوتے ہیں کہیں جو تانے کر کھڑی ہو گئی

تو اور مصیبت۔"

منوّر نے راحت سے ذکی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا اور اب یہ اس کا معمول ہو گیا کہ دوپہر کو یا شام کو پیدل ادھر سے اس امید پر گزرتا کہ شاید نورنگ نظر آ جائے۔

تیسرے روز اتفاقیہ دوپہر کو نورنگ کسی برابر کے مکان میں گئی ہوئی تھی، واپسی پر منوّر نے اس کو دیکھ لیا۔

قریب آ کر بولا:

"اگر تم برا نہ مانو تو میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

نورنگ نے پوچھا:

"آپ کون ہیں کیا کام ہے؟"

منوّر نے جواباً کہا:

"ایک روز پکنک میں میں نے تم کو ہاکس بے پر دیکھا تھا۔ اسی روز سے اس کوٹھی کے چکّر لگا رہا ہوں۔ ویسے میں ڈرائیور ہوں سعادت صاحب کی گاڑی چلاتا ہوں۔"

نورنگ نے غور سے منوّر کو دیکھا اور ڈری کہ کوئی بات کرتے دیکھ نہ لے۔

اس نے پوچھا:

"آپ کا نام کیا ہے؟ کیا آپ کو نوکری چاہیے مگر ہمارے ہاں تو ڈرائیور ہے!"

منوّر نے جواب دیا:

"میرا نام صنوبر خان ہے ویسے تو میں نوکر ہوں۔ صرف تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

نورنگ نے گھبرا کر کہا :

"مگر اس طرح راہ میں کسی کو روکنا بہت برا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔

اور منوّر منہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

دوسرے روز ـــــ

نورنگ فٹ پاتھ پر کھڑی تھی کہ اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر ٹھہر گئی۔ دیکھا تو منوّر بیٹھا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر بولا :

"برا نہ ماننا میں اُدھر ہی جا رہا ہوں تم بیٹھ جاؤ تم کو وہاں چھوڑ دوں گا۔"

نورنگ نے پہلے تو کچھ سوچا مگر دو منٹ بعد تیار ہو گئی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

وہ شہر کی لڑکی تو تھی نہیں کہ بنتی۔ وہ تو سیدھی سادی دیہاتی لڑکی تھی۔ دیہات کی لڑکیاں بے خوف ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گاؤں کے لڑکوں سے باتیں بھی کرتی ہیں ملتی بھی ہیں ان کو تو بننا آتا ہی نہیں ہے۔

منوّر نے گاڑی کلفٹن کی طرف موڑ دی اور کلفٹن پر ایک جگہ گاڑی روک کر بولا :

"نورنگ ! میں صرف اس لیے یہاں آیا ہوں کہ تم سے چند باتیں کر لوں۔ تم بڑے گھر میں رہتی ہو۔ میں بے چارا صرف ڈرائیور ہوں مگر شریف آدمی ہوں۔ میں نے انٹرنس تک پڑھا ہے مالک کو خوش رکھتا ہوں۔ کچھ تنخواہ کے علاوہ بھی مل جاتا ہے تم سے

کبھی دغا نہیں کروں گا۔ اگر تم راضی ہو تو میں پیغام دے کر باقاعدہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آوارہ مزاج نہیں ہوں۔"

نورنگ نے سچ بولتے ہوئے کہا :

"شاید تم کو یہ نہیں معلوم کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ مجھے انھوں نے اپنے گھر رکھا ہوا ہے میرے ماں باپ کا کوئی پتہ ہی نہیں کہ کہاں ہیں۔"

منوّر نے کہا :

"مجھے سب کچھ معلوم ہے نورنگ ! میں دولت کے لالچ میں شادی نہیں کر رہا ہوں۔ وہ بڑے لوگ ہیں ان کی بیٹی کے لائق کہاں ہوں۔"

نورنگ نے پوچھا :

"تو کیا تم یہ سب کچھ جان بوجھ کر مجھ سے یہ کہہ رہے ہو ؟"

منوّر نے جواب دیا :

"ہاں ! میں تو صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں نورنگ ! کیا بیگم صاحبہ میرا پیغام منظور کر لیں گی ؟"

نورنگ بولی :

"ان کو شہناز کی شادی کی فکر ہے جب تک شہناز کی شادی نہ ہو جائے میری ان کو کیا فکر۔ ویسے تم جانو۔ بالکل بے تکی سی بات ہے۔ تم میرا پیچھا نہ کرو تو اچھا ہے۔ فضول مری مشکل ہو جائے گی۔"

منوّر نے کہا :

"یہ سب کچھ میں کر لوں گا تم فکر نہ کرو۔ میں اس کام کے لیے ان کی

خوشامد کر لوں گا۔ مگر تم ہاں کر دو۔"

اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔

اور ذکی صاحب کی کوٹھی کے قریب لا کر نورنگ کو اتار دیا۔ نورنگ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

نورنگ دل میں پریشان بھی تھی اور خوش بھی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا۔ منوّر کی گوری چٹی شکل، کسرتی بدن اور ہنس مکھ چہرہ بار بار اس کو یاد آ رہا تھا۔ بے خیالی میں شہناز کے کپڑوں پر استری کرتے کرتے وہ گنگنانے لگتی اور کبھی زیر لب مسکرا دیتی۔ کبھی اس کے حسین و شگفتہ چہرے پر غم کے بادل چھا جاتے۔

شاید وہ اس یکساں زندگی سے عاجز آ چکی تھی۔

اس کے کمرے میں مسہری پر بستر کیا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹرنک میں اس کے کپڑے بند تھے۔ کونے میں چھوٹی میز پر ہلکے نیلے رنگ کا میز پوش پڑا تھا۔ جس پر اس نے خود ہی گلاب کا پھول کشیدہ کاری سے بنایا ہوا تھا۔ اس پر پلاسٹک کی ٹوکری میں اس کا سلائی کا سامان رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے اور کھڑکی پر بھی نیلے رنگ کے سستے کپڑے کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں استری کا سٹینڈ رکھا ہوا تھا جس کے قریب کھڑی وہ کپڑے استری کر رہی تھی۔

استری ختم کرنے کے بعد اس نے کپڑوں کو ایک طرف رکھا اور تکان سے انگڑائی لی اور جا کر اپنے بستر پر آڑی ترچھی لیٹ گئی۔

تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتی رہی۔

اور پھر گانے کی طرز میں گنگنانے لگی۔

رفتہ رفتہ آواز اونچی ہوتی چلی گئی:

غزل:

جنونِ عشق نے کب دل پہ اختیار دیا
جب ہم نے آبلہ پائی میں دن گزار دیا

بپا تھا روحِ محبت میں حشر کا عالم
کسی کی یاد نے آ کر ہمیں قرار دیا

کھلے ہوئے ہیں گلستاں سے دل کی وادی میں
کسی کے ہجر نے وہ داغ پُر بہار دیا

کسے خبر کہ تصوّر کی لذّتیں کیا ہیں
شبِ سیاہ نے کیا کیفِ انتظار دیا

حسین شام کے دامن میں جب پناہ ملی
کہ تیری یاد میں دن ہم نے جب گزار دیا

شبِ سیاہ میں اک برق سی جب کوند گئی
رخِ حبیب نے اک خوابِ صد بہار دیا

گلوں کے رخ پہ یہ کس نے بکھیر دی شبنم
بہارِ حسنِ گلستاں کو بھی نکھار دیا

کچھ اس طرح سے چمن میں وہ آ گئے اے نورؔ
شمیمِ زلف سے گلشن کو بھی قرار دیا

٭

وہ گا رہی تھی کہ شہناز کالج سے آ کر کمرے میں اس کو تلاش کرتی ہوئی داخل ہوئی اور ہنستی ہوئی بولی:

"اوہو — اکیلے ہی اکیلے۔"

نورنگ نے مسکرا کر کہا :

"تم نہیں ہوتی ہو تو دل گھبراتا ہے۔ ویسے ہی گنگنانے لگی تھی۔"

شہناز نے کہا :

"ہاں آج شام پارٹی میں بھی تو جانا ہوگا۔ تم نے میرے کپڑے تیار کر دیئے ہ؟"

نورنگ نے جواب دیا :

"ہاں بالکل تیار ہیں دیکھو یہی جوڑا تو تم کو چاہیے تھا نا — پیازی رنگ کا۔"

شہناز نے پوچھا :

"آج تم بھی چلو گی نا میرے ساتھ ؟"

نورنگ نے جواب دیا :

"نہیں شہناز نئی بات کرنے سے کیا فائدہ ؟ میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔"

ذکی صاحب دفتر سے واپس آگئے اور آتے ہی انھوں نے نورنگ کو آواز دی :

"بیٹی نورنگ ! بے بی آگئی ہیں میز پر کھانا لگوا دو۔"

اور وہ شہناز پر ایک نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میز پر کھانا آیا۔

اور چند منٹ میں سب لوگ میز کے گرد جمع ہو گئے۔ نورنگ بھی کھانا ان کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔

ذکی صاحب بولے :

"بیگم یہ کریلے کس نے پکائے ہیں بہت ہی لذیذ ہیں۔"

بیگم ذکی نے جواب دیا :

"اے اور کون اتنی مزے دار چیز پکا سکتا ہے سوائے نورنگ کے - ان ہی کو شوق ہے باورچی خانے میں گھسنے کا۔"

ذکی صاحب شہناز سے مخاطب ہوئے :

"بیٹی شہناز ! تم بھی اپنی بہن سے چند چیزیں پکانا سیکھ لو۔ جس روز یہ باورچی خانے میں نہیں جاتیں کھانا بالکل بے مزا ہو کر رہ جاتا ہے۔"

شہناز بولی :

"ابا یہ بڑی کنجوس لڑکی ہے۔ اپنا ہنر مجھے کیوں سکھائے گی۔"

نورنگ نے کہا :

"لو بھلا مجھے آتا ہی کیا ہے صرف تھوڑا سا پکا لیتی ہوں۔"

شہناز کہنے لگی :

"خیر بنو مت۔ اتنا عمدہ سینا اور بننا تم کو آتا ہے اور اتنا عمدہ پکانا آتا ہے جو مجھے عمر بھر بھی نہیں آ سکتا۔"

بیگم ذکی بولیں :

"چلو کھانا کھاؤ لڑو مت دونوں۔"

ذکی صاحب نے مسکرا کر کہا :

"بیگم دونوں ایسی لڑتی ہیں جیسے اوپر تلے کی بہنیں ہوں۔"

شہناز نے کہا : "تو اس میں شک ہی کیا ہے ؟"

گرمی اپنے شباب پر تھی اس لیے نو کی صاحب مع خاندان کے ایبٹ آباد چلے گئے تھے اور وہاں ایک دوست کی نصف کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے یہ دوست ایبٹ آباد ہی کے رہنے والے تھے۔

شہناز اور نورنگ بھی ہمراہ تھیں۔

نورنگ کو اس کے بعد منوّر کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی جوانی کی ترنگ میں یہ صاحب پیچھے لگ گئے اور اب دیکھا کہ لڑکی بڑے گھر میں رہ رہی ہے تو غائب ہو گئے مگر نہ جانے کیوں اس کو جب بھی منوّر کا شگفتہ چہرہ یاد آتا دل میں یہ ہی خیال پیدا ہوتا کہ یہ شخص دھوکا باز نہیں معلوم ہوتا۔ رات کو جب وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹتی تو اس کو بار بار منوّر کا خیال آتا اور وہ سوچتی کہ کاش وہ پتہ ہی معلوم کر لیتی مگر اس نے تو کچھ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح وہ اس کی زندگی میں آیا بھی اور چلا بھی گیا۔

اندر ہی اندر وہ اس غم میں گھل رہی تھی۔

پہلے ہی ماں کی جدائی کا غم کم نہیں تھا اب یہ ایک اور نیا غم پیدا ہو گیا۔ یہ بات کسی سے کہنے کی بھی تو نہیں تھی اور اگر وہ کہہ بھی دے تو لوگ کیا کہیں گے کہ عجیب لاپروا لڑکی ہے گھر بار اور ماں کو بھول کر عاشقی کے چکر میں پڑ گئی۔ کبھی کبھی اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تو وہ اندر ہی اندر رضائی میں آنسو بہا لیتی۔

اور روتی روتی سو جاتی۔

ایک صبح شہناز اور نورنگ پیدل گھر سے نکلیں۔ نورنگ نے شہناز کو اس کی ایک دوست کے گھر چھوڑا جس سے اس کو ملنا تھا اور خود کچھ چیزیں خریدنے مارکیٹ کی طرف چلی گئی اور شہناز سے کہہ گئی کہ میں واپسی میں تم کو ساتھ لے لوں گی۔

وہ ایک جنرل اسٹور میں داخل ہو گئی۔

چند چیزوں کا آرڈر دیا۔

دوکاندار سب پیکٹ باندھ رہا تھا۔

اچانک ہی اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے منوّر کھڑا تھا اور کچھ سامان خرید رہا تھا۔

اس نے جیسے ہی نورنگ کو دیکھا۔

آگے بڑھا۔

اور بولا :

"اوہ ! آپ اچھی تو ہیں یہاں کب آئیں ؟"

نورنگ کا چہرہ خوشی سے گلابی ہو گیا۔

اس نے جواب دیا :

"ہم سب لوگ پانچ چھ روز ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔"

نورنگ اور منوّر نے اپنا اپنا خریدا ہوا سامان اٹھایا اور دونوں دکان سے باہر نکل آئے۔

منوّر نے کہا :

"نورنگ ! میری دو باتیں ذرا سن لو۔"

نورنگ نے سنجیدگی سے کہا :

"بس رہنے بھی دیجیے۔ آپ لوگوں کو یہ کیا عادت ہوتی ہے کہ جہاں کوئی لڑکی دیکھی اس کے پیچھے لگ گئے۔"

منوّر بولا :

"نہیں نہیں۔ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔"

نورنگ نے پوچھا :

"ہاں تو اتنے دن سے آپ کہاں غائب تھے؟"

منوّر نے جواب دیا :

"اچھا تو تم خفا ہو۔ کیا بتاؤں کراچی ہی میں نہیں تھا۔ نوکری تو نوکری ہی ہے۔"

نورنگ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا :

"اچھا تو کہنا کیا ہے جلد کہیے۔"

منوّر نے کہا :

"تم اگر بڑے گھر میں رہتی ہو تو میں بھی شریف خاندان کا ہوں۔ مجھے تم کو چھیڑنا مقصود نہیں ہے۔ ڈرائیور ہوں مگر خیالات پاکیزہ ہیں۔ میں یہ بات صاف کرنا چاہتا ہوں کہ میرا پیغام ردّ تو نہیں کیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ مان لیں گی۔"

نورنگ نے جواب دیا :

"بار بار بتا چکی ہوں کہ میں امیر نہیں ہوں صرف اس گھر میں رہ رہی ہوں بظاہر میری اور آپ کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن یہ باتیں مجھے پسند نہیں ہیں کہ جہاں مجھے دیکھا روک کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے کیا خبر

وہ پیغام منظور کریں گی یا نہیں۔ وہ پہلے اپنی لڑکی کی شادی کریں یا میری کہہ تو دیا"۔

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور وہ بے رخی سے چل دی۔

منوّر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس کو اس کی بے بسی پر بہت رحم آیا۔ وہ دل میں شرمندہ تھا کہ ایک شریف لڑکی کو دھوکا دے رہا ہے۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ بیگم ذکی کو اگر یہ کہہ کر پیغام دے کہ وہ سعادت صاحب کا بیٹا ہے تو وہ کہیں گی کہ پیغام اپنے ماں باپ سے دلواؤ۔ اور اگر ماں باپ سے کہتا ہے تو وہ ایسی لڑکی کو جس کا حسب نسب تک نہیں معلوم بہو بنانا پسند نہ کریں گے۔

شام کی ٹرین سے کراچی سے راحت بھی آگیا اور بس سے ایبٹ آباد منوّر کے پاس پہنچا۔

منوّر ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

راحت بھی اسی کے پاس ٹھہر گیا۔

اس نے راحت کو ہمراز بنانے کی خاطر سب کچھ بتا دیا اور تاکید کر دی کہ اگر تم میرے ساتھ ہو اور نورنگ مل جائے تو میرا نام منوّر نہ بتانا بلکہ صنوبر خان ہی بتانا۔

ایبٹ آباد کا موسم بے حد خوش گوار تھا۔

بارش برس کر مطلع صاف ہو چکا تھا۔

چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر خوب صورت بنگلے دھوپ میں بہت خوب صورت نظر آرہے تھے۔

ذکی صاحب، بیگم ذکی، شہناز اور نورنگ پہاڑیوں کی طرف گھومنے نکل گئے۔ شہناز بیگم ذکی سے باتوں میں لگی ہوئی تھی۔ نورنگ موقع دیکھ کر ایک جگہ رک گئی۔ وہ تینوں آگے نکل گئے۔

وہ درختوں کے ایک جھنڈ میں پہاڑی کے ایک پتھر کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی:

"کاش کہیں امی کا پتہ لگ جائے۔ کتنی اچھی طرح یہ لوگ مجھے رکھتے ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں مگر امی میری پیاری امی آپ کدھر چلی گئیں۔ خدا کرے میری امی اور بھیا زندہ ہوں .... یہ صنوبر کتنا اچھا ہے ویسے تو شریف معلوم ہوتا ہے مگر اکثر لڑکے لڑکیوں کو پھنسا لیتے ہیں ...... نہیں نہیں صنوبر ایسا نہیں ہے وہ شکل سے شریف معلوم ہوتا ہے مگر ...... میں تو بے بس ہوں۔ ان لوگوں میں رہ رہی ہوں جو غیر ہیں اگر صنوبر نے کہا بھی تو وہ کیوں سنیں گے .... مگر نہ معلوم کیوں صنوبر کا چہرہ بار بار میرے سامنے آجاتا ہے۔ میں لاکھ کوشش کروں بھلا نہیں سکتی .... اُفوہ ..... میں یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں ....."

ایک دم کسی نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اور وہ خیالات سے چونک پڑی۔

گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔

تو منور اور راحت دونوں کھڑے ہیں۔

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا :

"اوہ آپ نے تو مجھے ڈرا دیا۔"

منوّر نے کہا :

"یہ میرے دوست راحت ہیں اور یہ نورنگ ہیں۔"

نورنگ کھڑی ہو گئی مگر وہ خوف سے چاروں طرف دیکھنے لگی کہ بیگم ذکی وغیرہ واپس نہ آ رہے ہوں۔

وہ گھبرا کر بولی :

"اس وقت آپ لوگ جائیے وہ سب لوگ واپس ادھر ہی آ رہے ہوں گے۔"

راحت نے کہا :

"مگر آپ نے میرے دوست منور پر نہ معلوم کیا جادو کر دیا ہے کہ اس کی حالت خراب ہے۔ یہ آزاد قبیلے کا آدمی یہ کیا جانے پابندیاں۔"

منوّر بولا :

"جب تک آپ مجھ سے وعدہ نہ کریں کہ گھنٹہ بھر کو مجھ سے کسی جگہ ملیں گی۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

نورنگ نے وعدہ کر لیا :

"بہتر ہے میں کل اسی دکان پر صبح گیارہ بجے آپ سے ملوں گی۔ اور اب خدا کے لیے آپ جائیے۔"

دونوں سلام علیکم کہتے ہوئے ایک طرف کو مڑ گئے۔

راحت بولا :

"منوّر! یہ لڑکی تو کچھ عجیب گھبرائی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔ یار اس چکّر میں مت پڑو۔ کہیں کوئی مصیبت نہ آ جائے۔"

منوّر نے کہا:

"نہیں راحت! صرف وہ بے چاری ڈرتی ہے ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آجکل ایسی پاکیزہ لڑکیاں کہاں ملتی ہیں۔ ایک بار میں خود اس سے بات کر لوں پھر تم کو پیغام لے کر بیگم صاحبہ کے پاس بھیجوں گا۔"

راحت ہنس کر بولا:

"تو یہ پدر بزرگوار والے فرائض میرے ذمّہ ہیں۔"

منوّر نے کہا:

"یار برا نہ مانو مت پھر کیا کیا جائے۔"

راحت کہنے لگا:

"میری سمجھ میں تو یار یہ آتا نہیں ہے کہ شادی تمھاری ہو رہی ہے اور تمھارے والدین اس لڑکی سے نہیں کریں گے جو تم کو پسند ہو تعجّب ہے۔"

منوّر بولا:

"جب تم کسی جگہ پہنچو گے تو پتہ چلے گا کہ تمھاری ماں راضی ہوتی ہیں یا نہیں۔"

راحت نے جواب دیا:

"نہیں نہیں۔ امّی اس خیال کی ہرگز نہیں ہیں۔"

دونوں باتیں کرتے کرتے اس ہوٹل تک آ پہنچے جہاں یہ دونوں

قیام پذیر تھے۔

ایبٹ آباد میں اچھی خاصی سردی تھی۔
کمرے میں آتش دان سلگ رہا تھا۔
کھانے کی میز کے چاروں طرف ذکی صاحب، شہناز، بیگم ذکی اور نورنگ ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔
دونوں لڑکیاں لانبی آستین کے سویٹر پہنے تھیں۔
بیگم ذکی سویٹر کے علاوہ شال بھی لپیٹے تھیں۔ ان کو کچھ زیادہ ہی سردی لگتی تھی۔
باتیں ہو رہی تھیں۔
بیگم ذکی بولیں:
"بیٹی نورنگ آج تم درزی سے میرے گرم بلاؤز لا دو، وہ تیار ہو گئے ہوں گے۔ سردی بہت لگتی ہے۔"
نورنگ نے جواب دیا:
"جی امی جان مجھے خود خیال ہے تھوڑی دیر بعد سامان لینے بازار جاؤں گی تو بلاؤز بھی لیتی آؤں گی۔"
ذکی صاحب بولے:
"بیٹی نورنگ! پھل وغیرہ زیادہ لایا کرو۔ یہاں تم لوگ پھل اچھی طرح کھایا کرو۔"
نورنگ نے جواباً کہا:

"جی ابّا جان! آج میں پھل زیادہ ہی لاؤں گی۔ کل شہناز بھی شکایت کر رہی تھی۔"

پھر اس نے شہناز سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"شہناز! تم بھی مارکیٹ چلوگی نا میرے ساتھ؟"

شہناز نے جواب دیا:

"نہیں نورنگ آج میرا موڈ نہیں ہے تم اکیلی آج چلی جاؤ۔"

نورنگ نے ناشتے کے بعد کپڑے تبدیل کیے۔

کینوس کا بیگ سنبھالا۔

اور پیدل ہی نکل گئی۔

سفید شلوار، کاٹن کا پرنٹڈ قمیص اور نیلا دوپٹہ، نیلا ہی پوری آستین کا سویٹر پہنے وہ بازار پہنچی۔

جلدی جلدی پھل خریدے۔

اور جنرل اسٹور کی طرف مڑ گئی۔

اسٹور کے باہر ہی منوّر انتظار کر رہا تھا۔

اس نے کہا:

"اس طرف آجائیے۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک پہاڑی کی طرف مڑ گئے اور درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ کر منوّر نے کہا:

"آپ کا وعدہ ایک گھنٹے کا ہے اب یہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کیجیے اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔"

نورنگ بولی:

"آپ ہی نے تو بلایا تھا آپ ہی بتایئے کیا کہنا چاہتے ہیں مجھ سے۔"

منوّر : (پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوئے)

"نورنگ تم جانتی ہو کہ میرا کوئی برا ارادہ تو ہے ہی نہیں۔ میں تو بات شروع کرنے سے پیشتر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے پسند بھی کرتی ہو یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہاں رہ کر تم محلوں کے خواب دیکھ رہی ہو۔ میں تو غریب آدمی ہوں۔"

نورنگ : (التجا آمیز نظروں کے ساتھ)

"میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اپنی حیثیت خوب معلوم ہے ایک گم نام لاوارث لڑکی !

منوّر : نہیں نہیں گم نام کیوں ہوتیں۔ ہو سکتا ہے۔ تمھاری ماں اور بھائی بعد کو مل جائیں اور وہ مخالفت کریں تو پھر کیا ہوگا — میں تو بیگم صاحبہ سے پیغام دلوادوں گا۔

نورنگ : پیغام دینا نہ دینا آپ کی خوشی ہے (نیچی نظروں کے ساتھ) میری ماں بڑی اچھی ماں ہیں۔ وہ میری خوشی پر خوش رہتی تھیں۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

منوّر نے محبت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے بکھرے بالوں کی لٹ سنبھالنے لگا۔

منوّر : تم اتنی رنجیدہ اور خوف زدہ کیوں رہتی ہو ؟

نورنگ : صنوبر ! وہ لوگ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں مجھے عزت سے رکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا نام خراب ہو اور وہ جانیں کہ کسی خراب خاندان کی لڑکی ہے یہ۔ اس لیے جو کچھ بھی کرو وہ سوچ

سمجھ کر کرنا چاہیے۔
یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔
بہتیرا منوّر نے روکا۔
مگر وہ بولی :
"بس اب دیر ہو رہی ہے۔"
منوّر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
جنرل اسٹور تک آ کر دونوں الگ الگ ہو گئے۔

ایبٹ آباد سے جانے کے بعد منوّر کا تقرر کیپٹن کا ہو گیا۔

درمیان میں وہ کراچی آ ہی نہ سکا۔

راحت بھی کراچی میں نہیں تھا جو وہ ہی نورنگ سے مل لیتا وہ بھی کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

نورنگ نے سوچا :

"کہ وہ ذکی صاحب سے ڈر گیا اور اب شاید وہ نورنگ سے ملنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔"

لیکن راحت کو منوّر سے چونکہ والہانہ محبت تھی اس لیے جب وہ کراچی آ گیا تو ایک روز یونیورسٹی سے واپس آتے ہوئے ناظم آباد کے بس اسٹاپ پر نورنگ کو کھڑا دیکھا تو وہ ٹھہر گیا۔ اس کو ایک دم خیال آیا کہ منوّر کی غیر حاضری سے کہیں وہ نا امید نہ ہو جائے نورنگ کے پاس جا کر بولا :

"سلام علیکم"

نورنگ اس کو دیکھ کر افسردگی سے بولی :

"وعلیکم السلام"

راحت نے پوچھا :

"کہیے مزاج تو اچھے ہیں ؟"

نورنگ نے بے دلی سے جواب دیا :

"ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں ؟"

راحت نے پھر پوچھا :

"ہمارے دوست کو تو آپ بھول چکی ہوں گی !"

نورنگ نے بے اختیار کہا :

"وہ ہی غائب ہو گئے ہیں۔"

راحت نے کہا :

"وہ غائب ہونے والا شخص نہیں ہے۔ سعادت صاحب نے فیکٹری کا انچارج بنا کر اس کو وزیر آباد بھیج دیا ہے۔"

(اس نے بات بنائی)

"پھر وہ آپ کو خط بھی تو نہیں لکھ سکتا بے چارہ کیا کرے۔"

اتنے ہی بس آ گئی۔ اور نورنگ "خدا حافظ" کہتی ہوئی بس میں سوار ہو کر چلی گئی۔

راحت جب بھی سعادت صاحب کے گھر جاتا رنجیدہ اور خاموش رہتا۔ مگر آج منوّر کا خط پا کر وہ بہت خوش تھا۔

اس کا دوست اب کیپٹن جو بن چکا تھا۔

پھوپھی بے چاری تو جاء نماز بچھا کر منوّر کی سلامتی کے لیے وظیفہ پڑھا کرتیں۔ کیونکہ اب یہی ان کے بچّے تھے وہ ویسے بھی لڑائی کی وجہ سے تباہ ہو چکی تھیں۔

وہ خط ملتے ہی سعادت صاحب کے گھر گیا۔

اور پھوپھی صاحبہ سے بولا :

"پھوپھی جان دعائیں مانگ مانگ کر آپ نے منوّر کو تو غازی اور

کپتان سب کچھ بنا دیا مگر ہمارے لیے ایک بھی دعا نہ مانگی۔"

پھوپھی بولیں :

"اے وہ تو بہادری سے ہندوؤں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ بیٹا! تم کیا کر رہے تھے جو تمھارے لیے دعا مانگتی۔ تم کراچی میں آرام سے بیٹھے ہو۔ وہ ٹھہرا بے چارہ فوجی۔"

راحت نے کہا :

"کوئی فوج میں مجھے لے بھی تو لے، پھر دیکھیے دشمن پر کیسے گولے برساتا ہوں۔ میں منوّر تھوڑی ہوں کہ آپ نے دعا مانگی اور وہ غازی بن بیٹھے۔ ذرا آپ دیکھنا پھوپھی جان کیسے دنادن کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے خود ہی ہاتھ کا نشانہ باندھ کر منہ سے دنادن کی آواز خوب زور سے نکالی۔

پھوپھی نے کہا :

"اے لڑکے ہوش کر گھر میں بیٹھا نقل اتار رہا ہے۔ یہ بھی کوئی تک ہے۔ وہ معصوم نہ معلوم کہاں جنگل بیابان میں کھڈوں میں پڑا بندوقیں چلا رہا ہوگا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے جھوٹ موٹ اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو صاف کیے۔

راحت نے کہا :

"پھوپھی لڑائی تو کب کی ختم بھی ہو چکی۔"

پھوپھی بولیں :

"اے بیٹا کیا بھروسہ ان بے ایمانوں کا۔"

راحت دل میں پھوپھی کی سادگی پر ہنسنے لگا کہ وہ بے چاری اس لڑائی کو بندوقوں ہی کی لڑائی سمجھ رہی ہیں حالاں کہ خود گولوں کی زد میں آ کر تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

دس روز کی چھٹی پر منوّر گھر آیا تو مہمانوں کی آمد و رفت اور روزانہ دعوتوں سے فرصت نہ ملی۔ کئی روز مصروف رہا مگر تب بھی اس نے گاڑی لے کر ذکی صاحب کی کوٹھی کے کئی چکّر لگائے کہ وہ کسی طرح نورنگ سے مل سکے۔ وہ ایسے وقت معمولی قمیص پتلون پہن لیا کرتا تھا۔

نورنگ منوّر کی بے رخی سے سخت اداس تھی۔ نہ اس کا کسی کام میں دل لگتا تھا اور نہ ہی وہ دلچسپی سے کچھ کر سکتی تھی۔ اس کی زندگی عجب طرح گزر رہی تھی وہ سیدھی سادی دیہاتی لڑکی تھی مگر چونکہ شریف خاندان کی تھی اور آسائش میں رہی تھی اور پھر پرورش بھی باعزت ماحول میں ہوئی تھی خیالات خراب نہ تھے مگر تب بھی اپنی کس مپرسی اور لاوارثی سے سخت خائف تھی۔

شہناز اپنے کمرے میں کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی اس کو رات کا کھانا کسی سہیلی کے ہاں کھانا تھا۔

شہناز کے کپڑے تیار کر کے نورنگ رکھ چکی تھی۔

شام کا وقت تھا۔

مارچ کا مہینہ۔

کراچی میں گرمی شروع نہیں ہوئی تھی مگر تب بھی برقی پنکھا چل رہا تھا۔

شہناز کا کمرہ کافی آراستہ تھا - فیروزی رنگ کے کریم کلر کے پردے لٹک رہے تھے - ابھی چھ بھی نہ بجے تھے - فضا پرسکون تھی - میز پہ پھولوں کا خوشنما گلدستہ مالی نے رکھ دیا تھا -

سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر قسم قسم کی شیشیاں اور پوڈر کے ڈبے چنے ہوئے تھے - مسہری کے برابر میز پر چند انگریزی کتابیں اور رسالے پڑے تھے -

شہناز نے وقت گزارنے کی خاطر ایک فلمی انگریزی رسالہ لے لیا تھا اور وہ فلموں پر تبصرہ پڑھ رہی تھی -

برابر والی کرسی پر نورنگ بیٹھی کسی اردو رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی -

شہناز نے کہا :

" نورنگ ! تم اتنی افسردہ اور خاموش رہتی ہو کہ نہ کہیں جاتی ہو نہ آتی ہو - ایک فلم بڑی اچھی آرہی ہے دیکھنے چلیں گے ۔"

نورنگ نے جواب دیا :

" اوں ہوں ! شہناز مجھے فلموں سے شوق نہیں ۔"

شہناز بولی :

" کیا بہکی بہکی باتیں کرتی ہو کراچی کی کون سی لڑکی ایسی ہے جو فلموں سے شوق نہ رکھتی ہو ۔"

نورنگ نے کہا :

" میں کراچی کی کب ہوں ۔"

شہناز کہنے لگی :

" خیر ہوگا ، میں تو لے کر چلوں گی مگر تم اس وقت میرا ایک کام کر دو - ذرا شیریں کے گھر جا کر کہہ دو کہ میں کل اس کے گھر نہ آسکوں گی -

اس کے گھر فون نہیں ہے ورنہ فون کر دیتے ۔"

نورنگ نے کہا :

"اچھا" !

یہ کہہ کر وہ کسل مندی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی ۔

نورنگ گھر سے نکل کر دوسری طرف مڑ گئی ۔ ذرا سی دور جا کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی ۔ ایک بڑی سی موٹر آ کر رک گئی ۔

اور منور دروازہ کھول کر بولا :

"بیٹھ جائیے حضور" !

نورنگ نے نظر بھر کر دیکھا ۔

اور خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی ۔

اس نے سوچا :

"آج میں صاف صاف بات کر لوں گی کیوں یہ شخص میرے پیچھے لگا ہوا ہے ۔ کہتا ہے کہ میں شریف آدمی ہوں مگر باتیں کرتا ہے آوارہ لڑکوں کی سی ۔ ان لوگوں سے تو ڈر کے مارے دم نکلتا ہے اور مجھ سے فضول باتیں کرتا ہے ۔"

منور نے گاڑی تیز کر دی اور کلفٹن پہنچا ۔

اس نے دیکھا کہ ایک طرف مجمع کم ہے ۔ وہاں گاڑی کھڑی کر لی ۔

اور بولا :

"اب بتائیے کیا حال چال ہیں ۔ بہت دنوں بعد ملیں ۔"

نورنگ نے جواب دیا :

"وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔"

اس نے نظر بھر کر منوّر کو دیکھا۔

اس کی نظروں میں شکایت، التجا اور نرمی سب کچھ تھا۔ وہ اپنا غصّہ بھول چکی تھی۔ منوّر اس کو اپنے درد کا درماں بنتا معلوم ہو رہا تھا۔

منوّر نے پوچھا:

"اتنے دنوں میں تم نے ہم دونوں کے متعلق بھی کچھ سوچا؟"

نورنگ نے جواب دیا:

"صنوبر میں کیا سوچوں۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ میں کہہ چکی ہوں کہ میری ماں کا پتہ نہیں کہ زندہ ہیں یا مر گئیں۔ یہ ہی لوگ اب تو میرے ماں باپ ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور ان کی بیٹی شہناز مجھے بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔"

منوّر نے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"در اصل تمھاری شکل صورت اور عادت اس قابل ہے کہ وہ تم کو اپنے ہی خاندان کے کسی لڑکے سے بیاہ دیں۔ آخر ان کے رشتے دار لڑکے بھی تو ہوں گے۔

نورنگ مسکرائی۔

نہ معلوم کیوں اس کو ہنسی آگئی۔

وہ بولی:

"تم بہت جلد فیصلہ کر لیتے ہو، اور اسی وجہ سے غائب تھے شاید۔ تم خود سوچو اگر ان کا یہ خیال ہوتا تو آج میں بھی شہناز کی طرح کالج

میں نہیں تو کسی اسکول میں ضرور پڑھ رہی ہوتی۔ میرا حسب نسب ہی
جب ان کو نہیں معلوم تو وہ یہ سب کیسے سوچیں گے۔"

منوّر نے کہا :

"ہاں یہ تو درست ہے تو ان سے کہہ کر تم نے خود ہی پڑھنا شروع کر
دیا ہوتا — دوسری بات یہ کہ میں غائب تھا تو راحت نے تہیں
بتایا کہ میں شہر ہی میں کب تھا جو آتا یا ملتا۔"

نورنگ بولی :

"پڑھنے کی اب کیا عمر رہ گئی ہے۔ اردو کچھ لکھ پڑھ لیتی ہوں کافی ہے
ایک انڈسٹریل ہوم میں داخلہ لے لیا ہے کہ کچھ ہنر آجائے اور
وقت پڑنے پر نوکری کر سکوں۔"

منوّر کہنے لگا :

"اچھا تو نورنگ میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور کل پھر جا رہا ہوں۔
واپسی پر اب کے بیگم صاحبہ سے ملوں گا اور پیغام دوں گا۔ دیکھوں
وہ کیا جواب دیتی ہیں۔ ویسے تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔"

نورنگ نے کہا :

"اچھا چلو اب واپس تو چلو۔ وہ کہیں گے کہاں چلی گئی۔ جب ملتے ہو
یہی کہتے ہو پیغام دوں گا پیغام دوں گا۔ نہ معلوم وہ کون سا دن آئے گا۔"

منوّر نے کہا :

"میں تم کو یہ بتا دوں کہ میری طرف سے نا امید نہ ہو۔ وقت کا انتظار
کرو۔"

اس نے بڑے پیار سے اس کی بکھری ہوئی لٹوں کو چھُوا، اور پھر کہنے

لگا :

"نورنگ! اگر میں دیر سے ملوں تو سمجھ لینا کہ نوکری کی وجہ سے کہیں چلا گیا ہوں۔ اب تو پردیس ہی میں رہنا ہے۔ سعادت صاحب کا پورا کاروبار وزیرآباد میں ہے اور وہیں مجھے تعینات کر دیا گیا ہے۔ عجب کشمکش میں ہوں۔ چینی سے مہینے بھر کی چھٹی ملے تو بیگم صاحبہ سے مل کر معاملہ طے کروں بس اس لیے دیر ہو رہی ہے۔"

✣

نورنگ سفید کلیوں وار کرتا اور پیازی رنگ کی شلوار اور پیازی دوپٹہ اوڑھے اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہے - اردو کی ایک کتاب اس کے ہاتھ میں ہے - مگر نظریں دیوار پر ہیں -

کسی کیلنڈر میں سے نکال کر دو تصویریں پاکستان کے مناظر کی اس نے فریم کرا کر دیوار پر لگائی ہیں - ایک تصویر پر نگاہیں جمی ہوئی ہیں اور وہ اپنے خیالات میں غرق ہے -

" نہ معلوم صنوبر کہاں پھر غائب ہو گیا - اللہ کیوں بار بار
میں صنوبر ہی کو سوچتی رہتی ہوں - کتنا وجیہ آدمی ہے -
چہرے سے کسی بڑے گھرانے کا معلوم ہوتا ہے مگر
ہے بے چارہ غریب -
کہاں ہو صنوبر تم ؟
تم مجھے ملے ہی کیوں تھے ؟
تم سے پہلے تو میں نے کبھی تمھارے متعلق سوچا
بھی نہ تھا - "

اس نے تصویر پر سے نظریں ہٹا کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی مگر چند ہی منٹ میں وہ پھر سوچنے لگی -

کتاب ایک طرف رکھ دی -

کروٹ بدل لی۔

اب وہ اس میز کی طرف جو کونے میں پڑی تھی اور جس پر اس کی سلائی کی چیزیں ٹوکری میں رکھی تھیں دیکھنے لگی۔

اور سوچنے لگی :

"حامد صاحب ..... یہ بیگم صاحبہ کے بھانجے جب بھی آتے ہیں مذاق ضرور فرماتے ہیں۔ ولایت سے پڑھ کر آئے ہیں وہاں نہ معلوم کتنی لڑکیوں سے دوستی کی ہوگی ..... اور ..... اب مجھ پر ..... نظرِ کرم ہے ..... کئی بار دل چاہا ..... شہناز کو بتا دوں کہ یہ تمھارے منگیتر صاحب کیسے آوارہ گرد ہیں ..... وابستہ تو تم سے ہیں اور مذاق مجھ سے فرماتے ہیں ..... اور وہ غریب سمجھتی بھی نہیں ... ... کتنی پاکیزہ خیالات کی ہے شہناز ..... اور کتنی پیاری ہے ..... حامد صاحب کو تو ایک بار ایسا درست کر دوں کہ یاد کریں ..... مگر ڈر لگتا ہے شہناز نہ معلوم کیا سوچے ؟"

ایک دم کسی کے پیر کی چاپ کمرے میں سنائی دی اور عبدل ملازم نے آکر کہا :

"شہناز بی بی آپ کو بلا رہی ہیں حامد صاحب آئے ہیں۔"

"اچھا آ رہی ہوں۔"

کہتی ہوئی وہ اٹھی، دوپٹہ درست کیا اور نشست گاہ کی طرف چلی۔

دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ حامد کا قہقہہ بلند ہوا اور شہناز کی ہنسی کی ترنّم ریز جھنکار سنائی دی۔

نورنگ اندر داخل ہوکر بولی:

"کیا ہے شہناز..... حامد صاحب سلام علیکم!"

حامد نے سلام کا جواب دیا:

"وعلیکم السلام!"

اور پوچھا:

"کہیے کیسے مزاج ہیں کیا سو رہی تھیں؟ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں۔"

نورنگ نے بے دلی سے کہا:

"کتاب پڑھ رہی تھی۔ سونے کا تو وقت نہیں ہے۔

حامد نے شہناز سے مخاطب ہوکر کہا:

"دیکھ رہی ہو شہناز ان کی آنکھیں..... معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں ہیں جیسے مے کے دو پیالے بھرے ہوئے۔"

شہناز نے محبت سے نورنگ کی طرف دیکھا۔

اور کہا:

"ہاں نورنگ سچّی بات ہے تمھاری آنکھیں بے حد پیاری لگ رہی ہیں......"

نورنگ گھبرا گئی:

"یہ.... یہ آپ نے مجھے صرف بنانے کو بلایا ہے یا کوئی کام بھی ہے۔"

حامد مذاق کے موڈ میں تھا۔

چہک کر بولا :

" یہ ادا سب سے پیاری ہے کہ بات کہی اور بگڑ گییں۔"

شہناز نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا :

" بھئی کچھ بھی تو نہیں آج شام پکچر جانا ہے اور حامد کا اصرار ہے کہ تم کو بھی ساتھ لے جایا جائے۔"

نورنگ بولی :

" نہیں نہیں شہناز مجھے تو آج معاف ہی کر دو۔"

حامد نے کہا :

" یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے تو تین ٹکٹ پہلے ہی خرید لیے ہیں۔"

شہناز بولی :

" چلنا تو پڑے گا تم کو..... کیوں کہ آج میں تمھارے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

منوّر کو چھ ماہ ہو چکے تھے۔

وہ کسی نہ کسی طرح چھٹی لینے کی فکر میں تھا اور بار بار راحت کو لکھ رہا تھا کہ وہ نورنگ سے مل کر پیغام دینے کے لیے راہ استوار کرے۔

مگر راحت بھی کسی طرح نورنگ سے نہ مل سکا۔

آخر ایک روز منوّر کو چھٹی مل ہی گئی۔

اور وہ کراچی واپس آ گیا۔

اب کی بار اس نے نورنگ سے ملنا ضروری نہ سمجھا - فون نمبر اس کو معلوم تھا اس نے فون کرکے بیگم ذکی سے ملنے کا وقت مقرر کیا اور ایک معمولی سے کوٹ اور پتلون میں وہ راحت کو لے کر شام کو ان کی کوٹھی پر پہنچا -

گھنٹی بجانے پر عبدل باہر آیا - اور دونوں کو لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بیگم صاحبہ کو اطلاع دی -

بیگم ذکی کمرے میں داخل ہوئیں -

تو دونوں نے اٹھ کر تعظیم دی -

وہ جب صوفے پر بیٹھ گئیں تو یہ دونوں بھی ایک طرف پڑی ہوئی معمولی کرسیوں پر بیٹھ گئے -

شہناز اور نورنگ حامد کے ساتھ پکچر گئی ہوئی تھیں - ذکی صاحب بھی کہیں باہر تھے صرف گھر میں بیگم ذکی ہی تھیں -

بیگم ذکی : کہیے کیا کام ہے ؟

راحت : جی مجھے راحت کہتے ہیں - یہ میرے دوست صنوبر ہیں ویسے تو یہ سوات کے رہنے والے ہیں مگر عمر بھر سے کراچی ہی میں رہے ہیں -

بیگم ذکی : آپ دونوں کیا کام کرتے ہیں ؟

راحت : میں تو یہاں ایک دفتر میں کلرک ہوں - یہ صنوبر ایک فیکٹری میں وزیر آباد میں کام کر رہے ہیں - ایک سال پیشتر یہ ان ہی صاحب کی گاڑی پر ملازم تھے جن کی فیکٹری ہے انھوں نے ان کے کام سے خوش ہو کر اب فیکٹری پر لگا دیا ہے -

بیگم ذکی : اکثر لڑکے آج کل ملازمت کی تلاش میں آتے ہیں - میں سمجھی شاید

آپ لوگ بھی اسی کام سے آئے ہوں گے۔

منوّر : جی نہیں۔ خدا کے فضل سے ہم دونوں ملازم تو ہیں۔

بیگم ذکی : پھر کیا کام ہے آپ کو جو ملنا چاہ رہے تھے۔

راحت : جی در اصل ہم دونوں کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس کام میں آپ کی مدد چاہتے ہیں۔

بیگم ذکی : (حیرت سے)

تو اس میں میں کیا کر سکتی ہوں۔

راحت : بیگم صاحبہ آپ میرے دوست صنوبر کی شادی کرادیں۔ میں تو ابھی پڑھنا چاہتا ہوں رات کی کلاسز جوائن کی ہوئی ہیں۔

یہ کہتے ہوئے راحت نے بھولا سا چہرہ بنا لیا۔

بیگم ذکی : میں کیسے ان کی شادی کرا سکتی ہوں۔ آپ لوگوں کو جانتی تک نہیں کیا ان کا بڑا یا رشتے دار کوئی یہاں نہیں ہے۔

راحت : جی ان کا رشتے دار یا دوست جو ہے وہ صرف میں ہوں۔ بیگم صاحبہ آپ نے جو ایک شریف لڑکی پالی ہوئی ہے اس کے لیے خیال ہے آپ کی مہربانی سے اس کا گھر بس جائے گا لڑکی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

بیگم ذکی نے غور سے منوّر کو دیکھا۔ صورت سے شرافت ٹپک رہی تھی۔

وہ بولیں :

بیگم ذکی : ان کو تنخواہ کیا ملتی ہے ؟

راحت : ویسے تو ڈیڑھ سو ملتی ہے مگر تین سو تک بڑھ جاتے ہیں کیونکہ فیکٹری

کا مال فروخت ہوتا ہے تو اس پر ان کو کمیشن بھی ملتا ہے۔

بیگم ذکی : میں نے تو سوچا بھی نہیں ہے کہ ابھی اس کی شادی کر دوں۔ ..... غور کروں گی۔

(منور سے) :

رہنے کے لیے گھر ہے آپ کے پاس ؟

منوّر : بیگم صاحبہ گھر کا انتظام میں کر لوں گا ابھی تو پندرہ دن کی چھٹی پر آیا ہوں۔ شادی تو اتنی جلدی میں بھی نہیں کر سکتا۔ صرف آپ کا اقرار چاہیے کہ اطمینان سے واپس جاؤں۔

بیگم ذکی : دو روز کی مہلت دیجیے۔ پرسوں آئیے تو بتاؤں گی۔

بیگم ذکی کے ملازم عبدل نے چائے کے دو کپ لا کر دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔

چائے پی کر دونوں چلے گئے۔

بیگم ذکی نے ذکی صاحب سے تذکرہ کیا۔

اور بتایا :

" لڑکا شریف اور ہونہار معلوم ہوتا ہے۔"

ذکی صاحب نے کہا :

" مگر بیگم اتنی جلدی بھی کیا ہے ابھی تو بیچاری کو ہمارے گھر آئے چھ سات ماہ ہی ہوئے ہیں اس کی والدہ اور اس کے بھائی کا پتہ تو لگ جائے۔"

بیگم ذکی بولیں :

" آپ کو پتہ نہیں جوان لڑکی کی حفاظت کتنا مشکل کام ہے۔ چند روز

سے میں حامد میاں کو بہت متوجہ دیکھ رہی ہوں وہ تو اتفاق سے لڑکی بے چاری شریف ہے ورنہ گل کھلنے لگتے۔

ذکی صاحب بولے :

"اچھا تو حامد صاحب نے ہاتھ پیر نکالنا شروع کر دیئے ہیں — ہیں نا آخر آپ کے بھانجے۔"

بیگم ذکی کہنے لگیں :

"اے تو مجھے طعنے کیوں دے رہے ہو۔ جب گھر میں جوان جہان لڑکی ہوگی تو یہ ہی ہوگا۔ شہناز سے زیادہ خوب صورت ہے یا نہیں۔ کل ہی شہناز کو بے وقوف بنا کر حامد نورنگ کو پکڑ لے گیا وہ بے چاری تو جانا بھی نہ چاہتی تھی۔"

ذکی صاحب نے کہا :

"مگر شہناز کو تو عقل چاہیے۔"

بیگم ذکی بولیں :

"اے وہ بگلی کیا جانے۔ چھوڑو اس ذکر کو — فی الحال اس کا چپ چپاتے نکاح کر دیں گے ذرا یکسوئی ہوگی تو سال بھر بعد رخصت کر دیں گے۔ میں تو اچھا خاصا جہیز دوں گی نورنگ کو۔"

تیسرے روز بیگم ذکی نے حامد کی حرکات سے نورنگ کو بچانے کی خاطر منوّر سے ہاں کر دی اور منوّر کی بابت کچھ تحقیقات بھی کرنا پسند نہ کیا۔ کیوں کہ وہ نہ چاہتی تھیں کہ بات زیادہ کھلے۔

نورنگ بے چاری کی رائے تو کون لیتا۔

مگر کیوں کہ شہناز کی زبانی صنوبر کا نام کان میں پڑ چکا تھا وہ دل میں خوش

تھی۔

جمعہ کی شام کو نکاح ہونا قرار پایا۔

جمعہ بھی آ گیا۔

نورنگ صبح سے اپنے کمرے ہی میں رہی۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ کبھی تو وہ خوشی میں مسکرانے لگتی اور کبھی ماں اور بھائی کو یاد کر کے اس کے آنسو نکل آتے۔ مگر آج در اصل اس کی روح خوش تھی کہ ایک سال آنکھوں میں کٹ جائے گا پھر وہ صنوبر کے ساتھ خوش و خرّم زندگی گزارے گی۔

صبح صبح وہ چمن کی طرف نکل گئی۔

کراچی میں ابر کبھی کبھی آتا ہے۔ آج اتفاق سے ابر چھایا ہوا تھا۔ رات میں بوندا باندی بھی کچھ ہوئی تھی اور سبزے پر رونق تھی۔ سماں خوش گوار تھا۔ چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے۔

ایک طرف موتیا کے تختے کے قریب وہ گھومتی رہی اور رات کے کھلے ہوئے پھول توڑتی رہی۔

تھوڑی دیر چنبیلی کی کلیوں کو جمع کیا۔

آخر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کوٹھی کی سیڑھیوں پر جو چمن کی طرف جانے کے لیے بنی ہوئی تھیں بیٹھ کر گنگنانا شروع کر دیا:

غزل:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

(فیض احمد فیضؔ)

کچھ دیر وہ اکیلی ہی گاتی رہی۔

اس کے بعد وہ ٹہلتی ہوئی ایک جھاڑی کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔

اب اس کے تصوّر میں صرف منوّر تھا۔

اس کی حسین شکل اور درخشاں پیشانی، اس کا کسرتی بدن اور مسکراتا ہوا چہرہ۔

زیرِ لب ایک آہ کے ساتھ وہ نیم دراز سوچنے لگی:

"اللہ میری بے تابیوں کو چھپا ہوا ہی رکھ۔ قدم قدم پر تو بدنصیبی ساتھ ہے۔ کہیں کچھ ہو جائے اور پورا کھیل ہی بگڑ جائے۔"

پھر اس نے حامد کو سوچا:

"حامد صاحب اتنے رئیس متمول لندن سے پڑھ کر لوٹے ہیں مگر کتنے لاابالی ہیں۔ تعجّب ہے شہناز کیوں نہیں سمجھتی۔ نہ معلوم مجھے کیا سمجھ لیا ہے۔ منگیتر تو شہناز کے ہیں اور ڈورے مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ توبہ — لعنت ہے ایسے ہرجائیوں پر۔"

وہ آہستہ سے اٹھی کیوں کہ بوندیں شروع ہو گئی تھیں اس کا دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ مسکراتی ہوئی اندر کوٹھی کے پچھلے دروازے سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شام کو منوّر اور راحت قاضی کو لے کر خاموشی سے آ گئے۔

بیگم ذکی نے اپنا جوانی کے زمانے کا کرن ٹکا ہوا سرخ جوڑا نورنگ کو پہنا دیا اور شہناز کا کچھ ہلکا ہلکا زیور بھی۔

راحت اور عبدل کی گواہی سے نورنگ کا نکاح منوّر سے ہو گیا۔

رات کے کھانے کا انتظام تھا۔

بیگم ذکی نے کہا:

"تم دونوں آج رات ہمارے ہی ساتھ کھانا کھاؤ گے تاکہ ذکی صاحب سے تعارف ہو سکے۔"

سب نے ایک ہی میز پہ کھانا کھایا۔

نورنگ کا کھانا اس کے کمرے میں چلا گیا۔

ذکی صاحب منوّر سے وزیر آباد کے کام کے متعلق باتیں کرتے رہے وہ ان دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

واپس جانے سے قبل منوّر نے نورنگ سے ملنے کی ترکیب نکال ہی لی۔

وہ اس کو گاڑی میں بٹھا کر دور لے گیا۔

اب تو وہ اس کی بیوی تھی۔

دونوں مطمئن تھے۔

مگر رخصتی نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں ان پر الزام آ سکتا تھا جتنی دیر بھی وہ یک جا رہ سکتے تھے وہ رہے۔ کیوں کہ نہ معلوم اب منوّر

کب لوٹے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے پروگرام بنائے۔

صبح کا وقت تھا۔

کلفٹن پارک پر اس وقت کوئی بھی نہ تھا۔

منوّر نے پیار سے نورنگ کی طرف دیکھا اور اس کو اپنے قریب لانے کی کوشش کی مگر نورنگ شرما کر ایک طرف ہٹ گئی۔

اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگی :

غزل :

حسین سبزہ زار تھا
چمن پہ اک نکھار تھا
نظر کو بھی قرار تھا
زمانہ پُر بہار تھا
خیال تھا وہ آئیں گے
سکون ساتھ لائیں گے
جو دیکھ لیں گے ان کو گل
تو جھوم جھوم جائیں گے
ہوا بھی سجدہ ریز تھی
شمیم عطر بیز تھی
یقین تھا وہ آئیں گے
یہ صبح حشر خیز تھی

یہ دل نہیں شرار ہے
قرار بے قرار تھا
مجھے یہ اعتبار ہے
کہ ان کو مجھ سے پیار ہے

منوّر نے قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھک کر دیکھا جہاں مسرت و انبساط کی پریاں رقصاں تھیں اور اس کے پشت پر بکھرے ہوئے بالوں کی ایک لٹ اٹھائی اور آہستہ سے ہونٹوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

فوارے کے قریب نورنگ نے اپنے سفید گورے پاؤں پانی میں لٹکا لیے اور منوّر بھی برابر ہی بیٹھ گیا۔

اور اب اس نے گنگنانا شروع کیا۔

منوّر کی آواز فضا میں گونجی :

غزل :

تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شبِ جاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے
نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

غرض مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو
ہزار بار نہیں لاکھ بار دیکھا ہے
مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط چند بار دیکھا ہے

وہ اسی طرح خوشی کی یہ گھڑیاں گزارتے رہے۔

نورنگ بولی :

"آخر تم مجھے وزیر آباد ہی کیوں نہیں لے چلتے ؟"

منور نے کہا :

"فیکٹری بہت دور ہے۔ رہنے کا گھر شہر میں ملے گا اور تم دن بھر اکیلی رہو گی۔ کبھی کبھی میری ڈیوٹی رات کی بھی لگ جاتی ہے۔"

نورنگ ٹھنک کر بولی :

"تو نہ معلوم کب انتظام ہوگا؟"

منوّر بولا :

"تم سے زیادہ مجھے جلدی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پیار سے نورنگ کے رخساروں کو چھونے کی کوشش کی مگر وہ الگ ہٹ گئی۔ اور منوّر بھی نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہو گیا اور کچھ سوچتا ہوا بولا :

"چلو اب چلیں تم کو دیر ہو رہی ہے۔"

نورنگ بالکل بھول چکی تھی کہ اس کو گھر جلد جانا ہے وہ اردگرد کے ماحول سے بے خبر چونک سی گئی اور اٹھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

☘

منوّر کے جانے کے بعد بیگم سعادت نے شبنم کی دوست خالدہ کے لیے منوّر کا پیغام شروع کر دیا۔

خالدہ خوب صورت، فیشن ایبل اور مالدار لڑکی تھی۔ اس کے والد وزارتِ دفاع میں ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ اگر خالدہ سے منوّر کی شادی ہو جائے تو اس کی ترقیوں کا نیا باب کھل سکتا تھا۔

شہر کے اونچے طبقے میں سب لوگ خالدہ کو جانتے تھے۔ سینٹ جوزفس کالج میں بی اے کا آخری سال تھا۔ اسی وجہ سے میاں کا ٹرانسفر ہونے کے باوجود اس کی والدہ پنڈی نہیں گئی تھیں کہ اس کا فائنل امتحان ہو جائے تو جائیں۔

بیگم سعادت کو خالدہ بے حد پسند تھی۔

کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ خود زندہ دل آدمی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ بہو بھی ان کی ہم مذاق آئے۔

دوسرے یہ کہ خالدہ آج کل کی سوسائٹی میں جانی پہچانی لڑکی تھی۔ سینٹ جوزفس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ کبھی پورا فقرہ اردو میں ختم نہیں کرتی تھی۔ اس کی زبان کا ہر فقرہ نیم اردو اور نیم انگریزی کا ہوتا تھا۔ اس کا لباس نیم عریاں ہر دیکھنے والے کو دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔ اس کا سلیولس بلاؤز اور اس میں سے اس کے گول سڈول مرمریں بازو جھانکتے ہوئے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جب بھی وہ باہر جانے کے لیے تیار ہوتی پورا ایک گھنٹہ میک اپ کی

نذر ہوتا۔

بیگم سعادت کو معلوم تھا کہ آج کل اسی قسم کی لڑکیاں شوہروں کی ترقی کا باعث ہوا کرتی ہیں وہ جانتی تھیں کہ ان کا گھر ترنم ریز قہقہوں سے گونج اٹھے گا اگر خالدہ کو وہ بیاہ کر لے آئیں۔

وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

کہ خالدہ کی ہر شام چند نوعمر لڑکوں کے ساتھ گزرتی ہے مگر یہ جانتے ہوئے بھی ان کی دلی خواہش اپنی جگہ تھی۔

منور کو خالدہ اور اس کے والدین نے بارہا دیکھا تھا اور منور بھی کئی ایک پارٹیوں میں خالدہ کو دیکھ چکا تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں شبنم کی کوشش کے باوجود وہ اس سے مکس اَپ نہ ہو سکا۔

والدین کے دلوں میں دونوں جانب معاملہ قریب قریب طے تھا مگر منور جس کے اقرار کرنے کا انتظار تھا اور جس کو وہ بارہا لکھ چکی تھیں وہ اب تک ٹال رہا تھا اور اسی ٹال مٹول میں چھ ماہ گزر چکے تھے

شبنم کی شادی کی تاریخ انور سے طے ہو چکی تھی۔

بیگم سعادت اسی کے ساتھ منورؔ کی شادی بھی کرنا چاہتی تھیں۔

نہ معلوم کیسے منور کو تین دن کی چھٹی مل گئی۔

اور وہ کراچی آ گیا۔

بیگم سعادت تو موقع کی منتظر ہی تھیں۔

انھوں نے سوچا کہ !

اس بار وہ سمجھا بجھا کر منور کو اس شادی کے لیے راضی کر ہی لیں گی اور انھوں نے موقع دیکھ کر تذکرہ چھیڑا :

بیگم سعادت : منور آخر تم کو خالدہ پر کیا اعتراض ہے ۔ شادی میں ہر چیز کا لحاظ رکھا جاتا ہے ۔ شکل بھی اچھی ہے ۔ مالدار باپ کی بیٹی ہے پھر تم کو اس کے باپ کرنل فراست کی وجہ سے ہر طرح کی ترقی ملے گی اور شادی سے تمھاری ترقیوں کا دروازہ کھل جائے گا تم جواب دو تو بات کروں ۔

منوّر : امّی — دراصل ابھی مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے ۔

بیگم سعادت : کیوں — ؟ یہ ہی شادی کی عمر ہے — کیا بوڑھے ہو کر شادی ہو گی ؟

منوّر : بات یہ ہے امّی کہ مجھے یہ تیز قسم کی لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں میں تو کوئی سیدھی سادی لڑکی دیکھ کر شادی کروں گا ۔ جلدی کیا ہے ۔

بیگم سعادت : سیدھی لڑکی تو لالوکھیت ہی میں ملے گی بیٹے ۔

منوّر : تو کیا ہوا — لالوکھیت کی لڑکیوں پہ آپ کو کچھ اعتراض ہے آخر وہاں بھی تو انسان ہی بستے ہیں ۔

بیگم سعادت : مگر ہر شخص کا کچھ معیارِ زندگی ہوا کرتا ہے اور شادی اپنے برابر کی حیثیت والوں میں کی جاتی ہے ۔

منوّر : کیا ہے آپ لوگوں کا معیارِ زندگی ؟ یہی نا کہ چند پیسوں کی کمی کی وجہ سے آپ اچھے خاصے شریف لوگوں کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے ۔

بیگم سعادت : منور مجھے افسوس ہے کہ تم نے فوج میں معمولی سپاہیوں کے ساتھ رہ کر اپنی حیثیت بھلا دی ہے ۔

منوّر : جی امّی جان۔ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ فوج میں تو اپنی حیثیت بہت سمجھائی جاتی ہے۔ قدم قدم پر معمولی سپاہی اور افسر کا فرق بتایا جاتا ہے مگر وہاں جاکر انسان یہ ضرور بھول جاتا ہے کہ روپیہ ہی دنیا کی ہر چیز پر افضل ہے۔

بیگم سعادت : خیر کچھ بھی ہو میرا یہ آخری فیصلہ ہے کہ تم کو خالدہ سے ہی شادی کرنا ہوگی۔ آخر ہم بھی کچھ عقل رکھتے ہیں۔ میں بات ڈال چکی ہوں اب ان لوگوں سے مجھے شرمندہ ہونا نہیں ہے صاف بات سن لو۔

ماں بیٹوں کی گفت گو ابھی یہیں تک ہوئی تھی کہ شبنم اور خالدہ دونوں قہقہے لگاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

خالدہ منوّر پر نظر پڑتے ہی ایک دم بولی:

خالدہ : ہیلو منور ! آپ کب آئے ؟ ہاؤ سویٹ یو آر ہیئر ؟ اس شبنم کی بچّی نے نہیں بتایا مجھے۔

اونچی "تنگ شلوار، سکیس قمیص بغیر آستین ہونے کے باعث اس کے سفید مرمریں بازو صاف نظر آرہے تھے۔

گلا اتنا نیچا کٹا ہوا تھا کہ سامنے سے خم دار اونچی چھاتیوں کے درمیان کی لمبی لکیر بھی نظر آرہی تھی۔

جالی کا پتلا دوپٹہ تفریحاً گلے میں پڑا تھا۔

شبنم نے کہا:

"اسی لیے تو میں کالج سے تم کو یہاں لائی ہوں۔ سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ ہی از آن لیو اونلی فار ٹو ڈیز۔"

منور خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
بیگم سعادت کو اس کی یہ خاموشی بری معلوم ہوئی۔
وہ بولیں :

"بیٹھو بیٹھو خالدہ !"

خالدہ نے دھم سے خود کو صوفے پر گرا لیا اور نصف انگڑائی کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

"اوہ ہاؤ ٹائرڈ"

وہ بولی۔

اور اس کی دونوں بغلوں میں سے سبزہ جھانکنے لگا۔
منوّر نے مسکرا کر خالدہ سے کہا :

"کون سا تیر مار کر آئی ہو کہ تھک گئیں ؟"

اور پھر دل ہی دل میں اس نے نوزنگ کی شرم سے جھکی ہوئی خوب صورت آنکھوں کو خالدہ کی بے باک نظروں سے ملایا۔
خالدہ نے جواب دیا :

"تیر تو آپ مارتے ہیں۔ چند روز کی لڑائی ہو گئی اور تقدیر نے بغیر کسی محنت کے آپ کو کیپٹن بنا دیا تو اپنے برابر کسی کو سمجھتے ہی نہیں ...... ریز آر دی مینرز اِن دی آرمی ......"

شبنم نے خالدہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا :

"چلو چھوڑو ..... ہاں امی آج کا کیا پروگرام ہے ..... خالدہ کو میں اسی لیے لائی ہوں کہ آج منوّر بھائی کے

ساتھ ہم دونوں ڈرائیوان سینما جائیں۔"

بیگم سعادت خوش ہو کر بولیں :

"ہاں ہاں ضرور جاؤ کسی نے منع کیا ہے۔ بیٹی !"

منوّر نے کہا :

"نہیں نہیں مجھے راحت کے ساتھ جانا ہے۔"

بیگم سعادت کہنے لگیں :

"تو راحت کوئی غیر تھوڑی ہے اسے بھی لے لو اور چاروں چلے جاؤ ...... کب سے شبنم تمھارا انتظار کر رہی ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک چبھتی ہوئی نظر منور پر ڈالی۔

اور بولیں :

"مگر میں نے جو بات تم سے کہی ہے اس کا جواب کل صبح مجھے مل جائے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ گئیں۔

منور بھی شبنم اور خالدہ سے معذرت کر کے اٹھ گیا کہ :

"مجھے راحت سے ضروری ملنا ہے ..... وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

راحت واقعی منوّر کا منتظر تھا۔

ناظم آباد میں اس کی خوب صورت کوٹھی جس میں اوپر کرایہ دار رہتے تھے اور نیچے راحت اور اس کی والدہ۔

راحت کی یہ کوٹھی نہایت سلیقے سے سجی ہوئی تھی اور اس میں ایک متوسط

خاندان کے رہنے کے لیے آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔
منوّر کی گاڑی کی آواز سن کر وہ فوراً باہر نکل آیا اور اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آیا۔
اور منور کو خاموش دیکھ کر بولا:
"کیا بات ہے تم چپ چپ ہو؟"
منور نے جواب دیا:
"امّی جان نے آج الٹی میٹم دے دیا ہے کہ خالدہ سے شادی کرو......"
راحت نے کہا:
"گھبرانے کی بات نہیں ہے تم پریشان مت ہوؤ۔ کل میں بھی آجاؤں گا اور ٹالنے کی کوشش کریں گے۔"
یہ کہہ کر اس نے بات کا رخ پلٹا:
"تم لاہور کب جا رہے ہو؟"
منوّر نے پوچھا:
"کیوں کیا کوئی کام ہے؟"
راحت نے کہا:
"ہاں دو ایک کام مجھے سوچا تھا تمھاری موجودگی میں جاؤں تو بور بھی نہیں ہوؤں گا اور تمھارا مہمان رہوں گا تو پیسے بھی بچیں گے۔"
منور کہنے لگا:
"سنا تو ہے کہ ہماری رجمنٹ کچھ دنوں کے لیے لاہور جا رہی

ہے جیسے ہی میں وہاں پہنچا تم کو تار دے دوں گا۔ چند پیسوں
پہ مر رہا ہے کنجوس۔"

راحت بولا :

" تم تو وہاں جا کر کچھ عجب لاپروائی کرتے ہو۔ دیکھو میرا
کام بھی ہے اور کنجوسی کی کیا بات ہے بھیّا میں تمھارے
ساتھ بھی کچھ دن رہنا چاہتا ہوں۔"

منور نے کہا :

" تم سے کیسے لاپروائی کر سکتا ہوں مگر یہ کنجوسی نہیں تو اور
کیا ہے کہ خود ہی کہہ رہے ہو پیسے بچیں گے۔"

راحت ہنس کر کہنے لگا :

" تو اس میں غلط کیا کہہ دیا میں نے۔"

❖

خالدہ اور اس کا خاندان ایک ہی خیال کے تھے۔
ان کے خیال میں آجکل کی آزادی میں ہر چیز تھی۔
خالدہ ایک سال کے اسکالرشپ پر امریکہ جا چکی تھی۔ صرف ایک ہی سال وہاں رہنے کی وجہ سے وہ زیادہ سے مغربی تہذیب کی دل دادہ ہو چکی تھی۔
بیگم سعادت کو منور کے انکار کے باوجود ضد تھی کہ وہ بیٹے کی شادی خالدہ ہی سے کریں گی۔ پہلے تو پیغام دے دیا اور سوچا کہ بعد کو وہ سمجھا بجھا کر منور کو راضی کر لیں گی۔ سعادت صاحب بھی مشورے میں شریک تھے اور خالدہ کے والدین سے دن دونے اور رات چوگنے تعلقات بڑھائے جا رہے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ شادی شبنم کی شادی کے ساتھ نہ بھی ہوئی، تو جب بہن کی شادی پر منور آئے گا تو سب کچھ طے ہو جائے گا مگر اب منور کے ٹالنے سے پریشان تھیں۔
خالدہ کو یہ معلوم تھا کہ منور سے اس کا پیغام ہے مگر تب بھی اس کی ہر شام تفریح میں بسر ہوتی تھی اس نے تین چار لڑکیوں اور تین چار لڑکوں کا ایک گروپ بنایا ہوا تھا۔
یہ گروپ شام کے لیے روزانہ نت نئے پروگرام مرتّب کرتا اور رنگ برنگی دلچسپیاں پیدا ہو جاتیں۔
کبھی ٹوئیسٹ ڈانس کی پارٹی ہے۔

کبھی ڈرائیو ان سنیما ہے۔

تو کبھی کسی ریسٹوران میں ڈنر ہے۔

منور کا جب سے پیغام شروع ہوا تھا تب سے اس نے شبنم کو گروپ سے کاٹ دیا تھا۔

ادھر شبنم خود بھی اپنی شادی کی وجہ سے ان شام کے پروگراموں سے بچنے لگی تھی۔ مگر ساتھ ہی شبنم کو یہ بھی معلوم تھا کہ آفتاب سے بہت دلوں تک خالدہ کی محبت کی پینگیں بڑھتی رہی تھیں۔

دوسرے روز بیگم سعادت کی طرف سے اعلانِ جنگ تھا۔

وہ منور سے بولیں :

"منور کل تم واپس جا رہے ہو۔ آج آخری بات ہو جائے تمھاری آئندہ چھٹیوں پر شادی کی تاریخ ٹھیرا دوں گی میں نے تمھارے والد سے بات کر لی ہے۔

منوّر : امّی میں ان لڑکیوں سے بیزار ہوں۔ امّی جب میں آتا ہوں کوئی طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ اتنی شدید جنگ میں حصہ لینے کے بعد انسان اپنے گھر سکون حاصل کرنے کے لیے آتا ہے۔ امّی مجھے دولت مند لڑکی نہیں چاہیے مجھے سکون چاہیے۔

بیگم سعادت : تم صاف کیوں نہیں بتاتے کیا وہاں کوئی مفلس لڑکی ڈھونڈ لی ہے؟

منوّر : میں نے وہاں کوئی لڑکی نہیں ڈھونڈی۔ وہاں کون لڑکی

بیٹھی ہے۔ لڑکیاں تو یہاں ہی بہت ہیں۔ بہت سے عزّت دار لوگ رہتے ہیں مگر ان کی لڑکیوں میں وہ بات نہیں جو کہ آپ کی پسندیدہ لڑکیوں میں ہے۔

بیگم سعادت : (جل کر)
کیوں میری پسندیدہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں ؟

منوّر : انتہائی آزاد ...... سیر سپاٹے کی دل دادہ .... گھریلو کاموں سے بے گانہ......

شبنم : (جو اتنی دیر سے خاموش تھی)
کیا آپ کو بیوی کو قید کرکے رکھنا ہے.... جیل میں بند کرنا ہے.... روٹی پکوانا ہے ..... ارادہ کیا ہے آپ کا بھائی جان ؟

منوّر : شبنم تم مت بولو .... معاملہ میرا ہے۔

شبنم : کیوں نہ بولوں .... میں نے کوئی گناہ کیا ہے .... آپ ہر وقت میری سہیلیوں کو بُرا کہتے رہتے ہیں ... امّی جان کی پسند کی لڑکیاں مطلب یہ کہ میری سہیلیاں۔

منوّر : تمھاری سہیلیاں تم کو مبارک ہوں ..... مگر مجھے کیوں پھانستی ہو .....

شبنم جز بز ہو کر جواب دینے ہی والی تھی کہ راحت ملنے آ گیا۔ راحت کو اندر آتا دیکھ کر بیگم سعادت بولیں :

"راحت تم ہی منوّر کو سمجھاؤ۔ شاید وہاں کوئی گاؤں کی لڑکی دیکھ کر ریجھ گئے ہیں۔ بیٹے تم نے تو خالدہ کو دیکھا ہی

ہے کیا بُری ہے۔

راحت : (ہنس کر)

اچھا تو یہ قصہ ہے۔ ہمارے نوشہ کے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں۔ خالہ جان بھلا آپ کی پسند کو کون برا کہہ سکتا ہے مگر ذرا ان کی بھی تو سن لوں۔

منوّر : میں اپنے کاموں میں مبتلا ہوں۔ ابھی ایمرجنسی ختم نہیں ہوئی امی کو شادی کی پڑی ہے...... بس ابھی میں شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔

بیگم سعادت : یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ منگنی تو کر سکتے ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو بتاؤ......

شبنم : (بگڑ کر)

وجہ یہ کہ میری سہیلیاں آزاد ہیں اور وہ ان کو پسند نہیں۔

راحت : نہیں شبنم یہ بات نہیں۔ ابھی فوج میں اطمینان نہیں ہے اس لیے منور کا دماغ پریشان ہے۔ خالہ جان آپ ان کی رائے پر چھوڑ دیں تو اب کی بار آکر یہ خود آپ سے شادی کا تقاضا کریں گے۔

بیگم سعادت : مگر شبنم کی بات طے ہو چکی ہے اسی کے ساتھ ان کی بھی بات طے ہو جاتی۔ لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

راحت : تو آپ شبنم کی شادی کر دیجیے۔ لڑکی والے اگر پکّے ہیں تو لڑکی ہاتھ سے کیوں نکل جائے گی۔

منور خاموش رہا۔

شبنم نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر جانے والی ہی تھی کہ خالدہ آ گئی۔

اور آتے ہی بولی :

"اوہ شبنم ! وٹ آر یو ڈوئنگ ہیئر ؟ میں نے تم کو تمھارے کمرے میں تلاش کیا۔"

خالدہ بغیر آستین کا بلاؤز پہنے تھی جو صرف اس کے سینے کے نشیب و فراز کو چھپائے ہوئے تھا۔ گردن کے نیچے پیچھے کی طرف پوری پیٹھ کھلی ہوئی تھی اور سامنے کا گلا اتنا نیچا تھا کہ دونوں بلّوریں چھاتیوں کا نصف حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ فرنچ شفان کی پرنٹڈ بلیو ساڑھی اس کی سرخ و سفید شکل پہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی ساڑھی کے پرنٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا :

"لُک ایٹ دِس پرنٹ ...... ڈیڈی پیرس سے لائے ہیں۔"

شبنم نے ماحول سازگار نہ دیکھا تو بولی :

"چلو باہر چمن میں چلیں .... ہم نے لاہور سے گلاب منگا کر لگائے ہیں تم کو دکھاؤں۔"

اور دونوں اٹھ کر چلی گئیں۔

❖

نورنگ کا نکاح تو ہو گیا۔
مگر نہ معلوم کیوں اس کو اطمینان نہ تھا۔
کبھی کبھی بے خیالی میں وہ منور کی دل ہی دل میں پرستش کرتی کہ خدا نے غیب سے کوئی اس کے لیے بھیج دیا۔
اور وہ سوچتی کہ :

"ایک چھوٹا سا گھر ہو گا۔ میں اس کو سجاؤں گی۔ کھانا تیار کروں گی اور صنوبر (منوّر) جب فیکٹری سے تھکا ماندہ آئے گا تو اس کے لیے ہر آرام فراہم کرنے کی کوشش کروں گی۔"

اس کے خیالوں میں صنوبر اور اس کا چھوٹا سا گھر بسا ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ اپنی بے بسی کو سوچتی اور بدنصیبی کا خیال آتا تو وہ سوچتی کہ :

"کیا ٹھیک ہے .... نہ گھر نہ در .... نہ ماں نہ باپ .... نہ معلوم میں کیوں اقرار کر بیٹھی، اگر وہ واپس ہی نہ لوٹے تو کیا ہو گا۔"

جب وہ منوّر سے ملتی تو اس کو ہر طرح اس کی شرافت پر اعتبار آ جاتا اس کی شکل پر اس کو عجیب طرح کی عالی نسبی کا گمان ہوتا لیکن جب وہ کچھ دنوں نہ ملتا تو اس کی مبہم سی شکل آنکھوں میں گھومتی اور اعتبار رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا۔

لیکن تب بھی وہ دل ہی دل میں اس کی پرستش کرتی۔

اس دفعہ جب منور گھر آیا تو اس نے نورنگ سے ملنے کی زیادہ کوشش نہ کی بلکہ وہ بیگم ذکی سے ملنے گیا۔

انھوں نے بڑی قدر سے بٹھایا۔

راحت بھی ساتھ تھا۔

باتوں باتوں میں راحت نے بیگم ذکی سے یہ اجازت لے لی کہ واپس جانے سے پہلے منور نورنگ سے مل لے اور یہ ملاقات ان ہی کی کوٹھی میں ہو۔ نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔ اس ملاقات میں نورنگ اور منورؔ آپس میں مل کر اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام بنالیں گے۔

بیگم ذکی نے اس وجہ سے اور بھی اجازت دے دی کہ وہ حامد (اپنے ہونے والے داماد) کی ترکیب دیکھ رہی تھیں کہ زبردستی وہ نورنگ پر مہربان تھے۔ انھوں نے سوچا کہ نورنگ کم سن لڑکی ہے ممکن ہے حامد کی طرف متوجہ ہوجائے اگر وہ منورؔ سے مل لے گی تو منورؔ ہی کا خیال دل میں رہے گا۔

چنانچہ یہ ملاقات نورنگ کے کمرے ہی میں ہوئی۔

نورنگ کو منورؔ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اپنے کمرے میں نہ معلوم کتنی بے تابیوں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی تو وہ اپنے کمرے میں اس چھوٹے سے آئینے میں خود کو دیکھنے لگتی جو کارنس پر رکھا ہوا تھا اور کبھی وہ اپنی سادہ سفید لٹھے کی شلوار کی کریز درست کرنے لگتی۔ کبھی وہ خیالات میں کھوسی جاتی اور گنگنانے لگتی۔ وہی فیضؔ کی پرانی غزل :

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ذرا سا کھٹکا ہوتا تو وہ سیدھی ہو کر دروازے کی طرف متوجہ ہو جاتی - ان کے آنے کی اطلاع ملتے ہی اس نے اپنا کمرہ جو ویسے بھی صاف ستھرا رہتا تھا نفاست سے اور بھی درست کر لیا تھا -

آہستہ سے دروازے پہ دستک ہوئی اور راحت اور منوّر کمرے میں داخل ہوئے -

نورنگ کھڑی تھی -

اس نے دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا اور خود اپنے بستر پہ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی -

راحت بولا :

" بھابی اس وقت میں تو یقیناً آپ کو بار نظر آ رہا ہوں گا کیونکہ یہ شادی کے بعد کی پہلی ملاقات ہے مگر بھابی بغیر دیور کے آپ کا کوئی کام نہیں چل سکتا - ملاقات کی اجازت کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ میں ان حضرت کے ساتھ رہوں "

نورنگ کی آنکھوں میں خوشی کی پریاں ناچ رہی تھیں -

مسکرا کر بولی :

" کیسے آپ نے سمجھ لیا کہ آپ مجھے بار معلوم ہو رہے ہیں ؟ "

راحت : مجھے دیکھ کر چہرے کا رنگ جو اڑ گیا آپ کا -

نورنگ : اوہ ! راحت بھائی .....

آج اس نے راحت کو بھائی کہا -

اور شرما کر نظریں نیچے جھکا لیں -

راحت اس کی شرمیلی شکل کو دیکھ کر ہنسنے لگا -

اور بولا :

" ہاں ہمیشہ اگر بھائی سمجھتی رہیں تو بھائی کا لفظ استعمال کیجیے ورنہ نہیں۔ اس پاک لفظ کی تکریم بھی فرض ہے۔

نورنگ : تو بھائی ہی تو ہیں آپ میرے۔

یہ کہہ کر اس نے منوّر کی طرف دیکھا جیسے کہ تائید چاہتی ہو۔

منوّر : تو بھائی ایک دوست تھا اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ تم نے اس کو اپنا بھائی بنا لیا۔

تینوں ہنسنے لگے۔

راحت : ہاں تو اب بن جائے آئندہ زندگی کا سہرا پروگرام جس کے نام سے بیگم صاحبہ سے اجازت ملی ہے۔

منوّر : پروگرام ہی کیا۔ بس جس روز مہینہ بھر کی چھٹی مل گئی اور مکان کا انتظام ہو گیا رخصت کر کے لے جائیں گے۔

نورنگ : اتنی سی بات کہنے کو آپ نے تکلیف فرمائی تھی۔

(اور وہ ہنس دی)

منوّر : نہیں باتیں تو بہت سی کرنا ہیں۔ میں چاہتا ہوں اس درمیان میں تمھاری اردو ذرا اچھی ہو جائے اور تم کچھ کتابیں پڑھ ڈالو۔ اسی لیے میں یہ پندرہ کتابیں اچھے مصنفین کی لایا ہوں یہ تم پڑھتی رہنا۔ ساتھ یہ دس سادی کاپیاں بھی ہیں یہ اس لیے کہ تم ان ہی کتابوں میں سے ان کاپیوں پر نقل کرتی رہا کرو۔ اسی طرح تمھاری تعلیم میں اضافہ ہوگا۔

راحت : اوہو تو مکتب کا مکتب اسی لیے کر آئے تھے۔

نورنگ : کیا کیا باتیں ہیں۔ کتابوں کا نام مکتب ہے۔ سچی بات ہے راحت بھائی
آپ کی باتیں بڑی مزے دار ہیں۔

راحت : شکریہ شکریہ !
جھک کر وہ آداب بجالایا۔
پھر بولا :
سنا ہے آپ گاتی بہت اچھا ہیں ان کو تو ستار لانا چاہیے تھا۔

منوّر : بکو مت۔ ستار تم اپنی بیوی کو دینا۔

راحت : اگر وہ گانا جانتی ہوں گی تو سب سے پہلا تحفہ میری طرف سے ستار
ہی دیا جائے گا۔ دیکھ لینا۔

نورنگ : یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ میں گانا اچھا جانتی ہوں۔

راحت : ہم ابھی آتے تھے تو کون گنگنا رہا تھا کہ :
گُلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

نورنگ : (شرما کر)
خدا کی قسم آپ تو غضب کرتے ہیں۔ کھڑے کن سنیاں لے رہے تھے
بعد کو اندر گھسے ہیں۔

منوّر : ابھی تم نے ان کے گُن نہیں دیکھے ہیں ذرا ملو گی تو پتہ چلے گا،
ہر فن مولا ہیں۔

راحت : ہاں تم خود تو پیر ہو...... ہم تو غنڈے ہیں .... ہماری
بھابی کو ہماری طرف سے بہکا رہے ہو مگر وہ بھی جانتی ہیں کہ
من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را۔

منوّر نے کہا :

"اب چلو کیا پٹائی کراؤ گے کافی دیر ہو گئی ہے۔"

دونوں اجازت لے کر چلے گئے۔

اور نورنگ سوچتی رہ گئی۔

+

منور کا کچھ عرصے بعد تبادلہ لاہور ہو گیا۔
اس نے راحت کو اطلاع دے دی۔
اور راحت بھی لاہور پہنچ گیا۔
یونیورسٹی بند ہو چکی تھی اور نتیجے کا انتظار تھا۔
شام کو فرصت کے لمحات میں دونوں شہر کی جانب نکل جاتے اور تفریحاً گھومتے رہتے۔

ایک روز یہ یونہی گھوم رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک سفید پوش لڑکی فٹ پاتھ پر جا رہی ہے اور اس کے پیچھے چند من چلے لڑکے لگے ہوئے ہیں۔ لڑکی عجیب طرح سراسیمہ اور پریشان جلدی جلدی چل رہی تھی کہ کس طرح ان لڑکوں سے جان چھوٹے اور لڑکے رنگ برنگے فقرے اس پر کس رہے تھے۔ لڑکی اپنے لباس سے غریب گھرانے کی معلوم ہوتی تھی۔ شکل خوب صورت مگر لباس سادہ لٹھے کی شلوار۔ موٹی ململ کا دوپٹہ اور سوتی پرنٹڈ قمیص۔

وہ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ نہ پیچھے دیکھ رہی تھی نہ سامنے۔ نیچی نظریں کیے بھاگی چلی جا رہی تھی۔

سامنے سے راحت اور منور آ رہے تھے۔ گھبراہٹ میں راحت سے اس کی "ٹکر" ہو گئی۔

اور اب اس نے جو نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے بھی دو لڑکے ہی نظر آئے۔
وہ اور زیادہ گھبرا گئی اور اس نے سمجھا وہ لڑکوں کے زرغے میں پھنس گئی ہے
یہ دونوں لڑکے بھی ان ہی لڑکوں کی ٹولی کے ہیں شاید۔
مگر اتنی دیر میں منور نے معاملے کو سمجھ لیا تھا۔
اس نے لڑکی کو روکا۔
اور بولا:
"کیا بات ہے گھبرائیے نہیں ہم آپ کی مدد کو آئے ہیں۔"
لڑکی سہم کر بولی:
"یہ سب میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ستا رہے ہیں۔"
منور نے بڑھ کر ایک لڑکے کو گردن سے پکڑا اور چشم زدن میں منوّر کا مُکّا اس کی ناک پر پڑا۔
اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
منور نے دو چار اور لگائے۔
اور کہا:
"یہ ہے سزا غریب لڑکیوں کو چھیڑنے کی۔"
باقی لڑکے بھاگ لیے۔
راحت نے جب تک توجہ کی وہ بھاگ چکے تھے۔
اس لڑکے نے بڑی منت سماجت کی تب منوّر نے اس لڑکے کو چھوڑا۔
سڑک پر زیادہ لوگ نہیں تھے اس لیے مجمع جمع نہیں ہوا۔
وہ لڑکا جان چھڑا کر ایک طرف بھاگا۔
منوّر نے لڑکی سے پوچھا:

"آپ کو کہاں جانا ہے ہم خود آپ کو پہنچا دیں گے۔"

وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ باوجود اس تمام قصّے کے اس کو ان دونوں پر بھی یقین نہ آ رہا تھا۔

مگر راحت اب سب کچھ سمجھ چکا تھا۔

وہ بولا:

"یہ میرے دوست کیپٹن منوّر ہیں اور میرا نام راحت ہے۔ کراچی سے آیا ہوں۔ ان کے پاس ٹھیرا ہوں۔ آپ اعتبار کریں اور بتائیں ہم کو کہ کہاں جانا ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا:

"قریب ہی پارک میں میرے بابا بیٹھے ہیں وہ تھک گئے تھے تو ان کو بنچ پر بٹھا کر میں امّاں کی دوا لینے گئی تھی۔ یہ لوگ دکان ہی سے میرے پیچھے لگ گئے۔ بابا کے پاس تک آپ مجھے چھوڑ دیجیے۔"

منوّر نے کہا:

"آئیے آپ ہمارے ساتھ چلیے۔"

گلستانِ فاطمہ کی طرف تینوں روانہ ہوئے۔

لڑکیوں کے غول تنگ شلواروں اور پھنسی ہوئی قمیصوں میں برابر سے گزر رہے تھے۔ اور ان کی باتوں کی سریلی آواز اور ترنّم ریز قہقہے فضا میں بکھر رہے تھے۔

یہ تینوں آگے بڑھتے رہے۔

چند لڑکیوں نے حیرانی سے دیکھا کہ ایک مفلوک الحال لڑکی دو اونچے طبقے کے لڑکوں کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔

ایک بولی :

"لیلا ہاؤ ونڈرفل .... کون ہے یہ لڑکی ؟"

لیلا نے جواب دیا :

"کلثوم آئی ڈونٹ نو .... سم پُوَر فیلو"

کلثوم نے کہا :

"کوئی من چلے معلوم ہوتے ہیں .... کہیں سے پکڑ لیا بے چاری کو۔"

لیلا بولی :

"اوہ ! ہوگا ..... ہمیں کیا انٹرسٹ"۔

سامنے بنچ پہ ایک بوڑھا آدمی خاموش بیٹھا آسمان کو تک رہا تھا۔ اس نے بیٹی کو دو لڑکوں کے ساتھ آتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ اور ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

لڑکی کے حواس درست ہو چکے تھے۔

وہ بولی :

"بابا ! یہ دونوں صاحب مجھے یہاں تک پہنچانے آئے ہیں۔ چند آوارہ لڑکے نہ معلوم کون میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ ان دونوں نے بچایا ہے مجھے ان کے چنگل سے ...."

پھر منور کی طرف اشارہ کر کے بولی :

"ان صاحب نے تو ایک کو خوب مارا بھی"۔

بوڑھا بولا :

"بیٹی یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ دیکھو آگے کیا ہوتا ہے"۔

پھر بوڑھے نے راحت اور منور سے کہا :

"میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری بیٹی کی عزت بچائی۔ آپ دونوں فرشتہ بن کر آگئے۔"

راحت تقریباً بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

اور بولا :

"کیا بات ہے بڑے میاں آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

اس نے مایوس نظروں سے راحت کی طرف دیکھا۔

اور آہستہ سے بولا :

"کچھ نہیں بیٹے . . . . قسمت کی گردش ہے۔"

منور کو بوڑھے کی پریشان حالی پہ رحم آ گیا۔

کہنے لگا :

"کیا کچھ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ میرا نام منور ہے۔ آرمی میں کیپٹن ہوں۔ یہ میرے دوست راحت ہیں۔"

بوڑھے نے کہا :

"بیٹے اپنی پریشانی میں ہوں کیا کہوں آپ سے ؟"

منور بولا :

"تو بتایئے نا کیا پریشانی ہے آپ کو . . . . . شاید ہم کچھ کام آ سکیں۔"

بوڑھے کو منور کی باتوں میں خلوص کی بو آئی۔

وہ کہنے لگا :

"میں لاہور ۱۹۴۸ء میں آیا۔ مہاجر ہوں۔ ملازمت کرتا تھا اب پنشن

ملتی ہے۔ ایک کلرک کی پنشن ہی کیا بس گزر ہو جاتی ہے۔ تین لڑکیاں ہیں۔ ایک ان تینوں سے چھوٹا لڑکا ہے۔ یہ میری منجھلی لڑکی قمر ہے اس سے بڑی قمر ہے جس کی عمر ۲۴ سال ہو چکی ہے۔ بمشکل اس کی شادی ٹھیری ہے۔ وہ لڑکا بھی دفتر میں کلرک ہے۔ میں نے سوچا تھا چپ چپاتے نکاح کر دوں گا مگر لڑکے والے جہیز بھی چاہتے ہیں۔ سخت پریشان ہوں۔ اتنی مشکل سے لڑکا ملا ہے اب وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میری بیوی بیمار ہے اگر اس کی زندگی میں شادی ہو جائے تو باقی بہنوں کی دیکھ بھال وہ کرے گی۔ میری بھی صحت خراب رہتی ہے۔ سانس کا مرض ہے اسی لیے قمر کو دوا لینے کو بھیج دیا اور خود یہاں ٹھیر گیا۔"

راحت نے کہا:

"بڑے میاں یہ تو آپ کے گھریلو معاملات ہیں۔"

منور بولا:

"نہیں نہیں۔ آپ بتائیں کہ ہم کس طرح آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

بڑے میاں نے جواب دیا:

"مجھے شرافت علی کہتے ہیں۔ بیٹا میں فقیر نہیں ہوں۔ مزدور آدمی ہوں۔ ایک شریف لڑکی کی زندگی کا سوال ہے۔ ہاتھ پھیلاتے شرم آتی ہے۔ اگر کوئی آپ کی ضمانت پر کچھ قرض دے دے تو آپ کا احسان ہو گا۔ اپنا گھر آپ کو دکھا دوں گا اور کسی نہ کسی طرح رقم ضرور ادا کر دوں گا۔ یہ لڑکیاں سلائی کر لیتی ہیں۔"

منور نے جیب میں سے بٹوہ نکالا اور سو روپیہ کا ایک نوٹ بڑے میاں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اور کہا :

" میں تو آپ کی یہ مدد کر سکتا ہوں فی الحال ۔۔۔۔ اور بھی سوچوں گا۔"

بڑے میاں نے لینے سے انکار کیا۔

ادھر لڑکی نے باپ کی طرف ذرا ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ اور بھی شرمندہ ہو گئے مگر منور نے زبردستی وہ نوٹ بڑے میاں کے کُرتے کی جیب میں رکھ ہی دیا۔

راحت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر پچاس روپیہ اپنے پاس سے بڑے میاں کو دیئے مگر ساتھ ہی بڑے میاں کے گھر کا پتہ اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔

دونوں دوست باپ بیٹی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

منور کے دماغ میں راستے بھر یہ بڑے میاں ہی رہے۔

اپنے کمرے پر واپس آ کر دونوں نے میس میں جا کر کھانا کھایا۔ شب خوابی کا لباس تبدیل کیا اور بستروں پر لیٹ گئے۔

منور بولا :

" راحت آج کے واقعہ سے تم نے کوئی نتیجہ اخذ کیا ؟"

حت نے جواب دیا :

"کیا نتیجہ اخذ کرتا ۔۔۔۔۔ تم نے میرے بھی روپے کھُوائے ۔۔۔۔ نہ معلوم کون فریبی بوڑھا تھا۔"

منور نے کہا :

"نہیں راحت! وہ فریبی نہیں تھا مجبور اور شریف انسان تھا۔ لڑکی کتنی معصوم اور شریف تھی۔ ہمارے معاشرے کی یہ خرابی ہے کہ والدین اپنے لڑکے کی شادی ایسی جگہ کرنا چاہتے ہیں جہاں سے کافی جہیز ملے سوچو یہ کتنی بری بات ہے۔ اس طرح بہت سی شریف لڑکیوں کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لڑکی کی یہ مشکل ہو رہی ہے، باقی دو کا کیا ہوگا۔ یہ دوسری بھی جوان ہے۔"

راحت نے کہا:

"ارے تو تم کون ہو.... کیا دنیا زمانے کے ٹھیکے دار ہو تم...."

منور کہنے لگا:

"نہیں راحت! مذاق مت کرو۔ سنجیدگی سے سوچو کہ اچھی اچھی لڑکیاں محض اس وجہ سے بیٹھی ہیں کہ ان کو جہیز نہیں ملے گا۔ اب میرا ہی معاملہ لے لو۔ نورنگ کیا بری لڑکی ہے مگر امی جان کو اگر معلوم ہو جائے کہ صاحبزادے کا نکاح ایک مفلس لڑکی سے ہو چکا ہے تو گھر میں کہرام برپا کر دیں گی اور ابّا جان سے نہ معلوم مجھے کیا کیا دھمکیاں دلوائیں گی۔"

راحت بولا:

"یہ تو پہلے ہی تم کو سوچنا چاہیے تھا۔ کیوں بے چاری معصوم صفت لڑکی کو تم نے پھانسا۔ پھر اپنی حیثیت تم نے اس سے الگ چھپائی جب یہ سب کچھ معلوم ہوا تو بیگم ذکی اور ذکی صاحب کیا کہیں گے۔ کتنی بڑی الجھن ہے۔"

منور نے جواب دیا:

"سب سے بڑی الجھن تو خالدہ ہے جو پیچھے لگ گئی ہے اور اماں جان

کو یہ لالچ ہے کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اور ہزاروں کے جہیز اور بڑی بڑی دو کوٹھیوں کی واحد مالک ہے۔ ان کو اس سے مطلب نہیں کہ خالدہ کس قسم کی لڑکی ہے ان کو تو دونوں کوٹھیوں کا لالچ ہے جو ہاؤسنگ سوسائٹی اور ڈیفنس سوسائٹی میں کھڑی ہیں۔"

راحت نے کہا:

"میں نے تو سنا ہے کہ ان کے گھر والوں سے تمھاری امّی جان نے بات بھی شروع کر دی ہے اور شبنم کی شادی پر معاملہ طے ہو جائے گا۔"

منور بولا:

"کتنی عجیب بات ہے کہ میرے انکار کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا رہی ہے۔ میں اسی لیے شبنم کی شادی پر جا نہیں رہا ہوں..... کہہ دوں گا کہ چھٹی نہیں ملی...... مگر راحت! یہ بے چارے بڑے میاں جو ملے بہت شریف آدمی نظر آتے تھے۔ کسی اچھے یو۔پی کے خاندان کے تباہ حال مہاجر ہیں۔"

راحت کہنے لگا:

"کل شام کو نکلیں گے تو ان کے گھر بھی چلیں گے تا کہ پورا حال تو معلوم ہو۔ مجھے تو اپنے پچاس روپوں کی فکر ہے۔ اسی لیے میں نے ان کا پتہ اپنے پاس نوٹ کر لیا تھا۔"

راحت کے یہ کہنے پر طے ہوا کہ دوسرے روز ضرور بڑے میاں کے گھر جایا جائے۔ اس کو فکر تھی کہ پچاس روپے صحیح جگہ پر خرچ ہوئے یا یونہی گئے۔ وہ اتنا رئیس آدمی نہیں تھا کہ منور کی طرح روپیہ بانٹتا پھرے۔

دونوں دوست برقی بلب بند کر کے سو گئے۔

راحت اور منور بڑے میاں کے بتائے ہوئے پتے پر لاہور کے ایک بعد غربت زدہ محلّے میں بوڑھے شرافت علی کو دریافت کرتے پھر رہے تھے۔ راستے میں شرافت علی کا لڑکا نظیر چند آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس نے جو باپ کا نام سنا اور دیکھا کہ دو شریف آدمی کھڑے دریافت کر رہے ہیں تو کہنے لگا:

"چلیے میں لے چلتا ہوں میں ان ہی کا بیٹا ہوں۔"

یہ دونوں لڑکے کے پیچھے پیچھے چل دیئے۔

گلیوں در گلیوں ہو کر ایک مکان پر پہنچے جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ لگا ہوا تھا۔

ان کو باہر کھڑا کر کے لڑکا اندر گیا۔

اور باپ کو بلا لایا۔

وہ ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

سلام علیک کر کے واپس اندر گئے۔

پانچ چھ منٹ کے بعد باہر نکلے۔

اور بولے:

"اندر تشریف لے آیئے۔"

اندر کا مکان صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ آگے چھوٹا سا آنگن اور ایک طرف

باورچی خانے کے لیے ذرا سا ٹین پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں ٹین ہی کا ذرا سا باتھ روم تھا۔ کمرے میں ایک پلنگ پر معمولی سا بستر تھا اس پر ان کی بیمار بیوی پڑی ہوئی تھی۔ آنگن میں دو پرانی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کو لڑکی لا کر اندر ڈال رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں پرانے سے قالین کا فرش تھا۔ ایک طرف ٹوٹے پھوٹے دو ٹرنک رکھے تھے اور دیوار پر لکڑی کی کھونٹیاں لگی تھیں ان پر بڑے میاں کا ایک سفید کُرتا اور ایک پاجامہ ٹنگا ہوا تھا۔

بڑے میاں کا لڑکا نظیر بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میلا قمیض اور میلا سا نیکر پہنے تھا۔ چہرہ بھی گلیوں میں کھیلنے کی وجہ سے میلا ہو رہا تھا۔

تینوں لڑکیاں سادے کپڑے پہنے ادھر ادھر کھڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ گھر میں دھو کر کپڑے پہن لیے ہیں جو بار بار خود دھونے کی وجہ سے پوری طرح صاف نہ تھے۔

یہ لڑکیاں بھولی بھالی اچھی خاصی شکلوں کی تھیں۔

بڑی لڑکی قمر کی عمر تیئیس چوبیس سال کی تھی۔ گورا چٹا رنگ اور معمولی سا ناک نقشہ۔

دوسری لڑکی مہر شاید اکیس بائیس سال کی ہو گی۔ کافی گورا رنگ۔ پتلی سی ناک۔ خوب صورت آنکھیں، موزوں قد۔

تیسری چھوٹی لڑکی بدر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ ہلکا گندمی رنگ، ناک آنکھ خوب صورت۔

بوڑھی ماں بستر پر پڑی کراہ رہی تھیں۔

باپ تو ضعیف آدمی تھے ہی۔ . . . لڑکا نظیر گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کھیل کر آوارہ گردی میں پڑتا جا رہا تھا اور انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر

یہی صحبت رہی تو چوری اور گرہ کٹی کے پیشے میں پڑ جائے گا - ابھی سے وہ نہ باپ کو خیال میں لاتا تھا نہ ماں کو۔

منور اور راحت کو بڑے میاں نے کرسیوں پر اصرار کر کے بٹھایا اور خود کوئی ٹوٹا ہوا سٹول ڈھونڈ کر لائے اس پہ بیٹھ گئے۔

منور نے ان کی بیوی کی بیماری کا حال پوچھا -

اور باتیں ہونے لگیں

اتنے میں بڑی لڑکی قمر دو پرانے کپوں میں چائے بنا کر لے آئی اور دونوں کے سامنے پیش کی۔

دونوں نے شکریہ کہہ کر چائے لی اور پینے لگے۔

کبھی کبھی یہ دونوں لڑکیوں کی طرف بھی دیکھ لیتے -

منجھلی لڑکی مہر کو خدا نے قدرتی حسن دیا تھا۔ میلی عنابی اوڑھنی اور گندی سی شلوار میں بھی اس کے گلابی رخسار پھوٹے نکل رہے تھے۔ آنکھوں میں بھی ایک قدرتی مسکراہٹ رقصاں تھی - اتنی مصیبت اور فاقوں میں بھی اس کے حسن میں کمی نہیں آئی تھی - اور وہ گلاب کے اس ترو تازہ پھول کی مانند نظر آ رہی تھی جو کانٹوں میں بھی حسین نظر آتا ہے۔

بڑی لڑکی قمر بھی گوری چٹی اچھی خاصی شکل کی تھی مگر بدر کا رنگ ان دونوں سے کم تھا۔

آج اطمینان سے جب مہر کو دیکھنے کا موقع ملا تو راحت اور منور دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے اور سوچتے رہے کہ غربت اور افلاس کی وجہ سے اس بتِ سیمیں کو کوئی پجاری نہ مل سکا۔

اسی کمرے میں ایک طرف جہاں دری بچھی ہوئی تھی سلائی کی پرانی سنگر مشین

دکھی تھی۔ اور اس کے گرد چند ادھ سلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی آمد سے قبل کوئی سلائی کر رہا تھا۔

باتوں باتوں میں بڑے میاں نے بتایا کہ :

"ان تینوں لڑکیوں کی سلائی کی محنت سے ان لوگوں کی گزر بسر میں کافی مدد ملتی ہے جو اُن کا لڑکا محلے میں سے لے آتا ہے مگر چند روز سے وہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومنے لگا ہے۔ جس کی وجہ سے اب سلائی بھی کم ہی ملتی ہے۔"

کمرے میں چاروں طرف نظر گھمانے سے پتہ چلا کہ یہ کمرہ بیٹھنے سونے اور سلائی کرنے کے کاموں میں بیک وقت استعمال ہوتا ہے۔

کمرے کے رکھ رکھاؤ سے لڑکیوں کی سلیقہ مندی اور انتہائی غربت کا اظہار ہو رہا تھا۔

پرانی سی ایک برتی پنکھیا اور ایک پرانا سا قالین جو مشین کے پاس بچھا تھا ماضی کے اچھے دنوں کی یاد دلا رہا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر پرانے کیلنڈروں میں سے کاٹ کاٹ کر تصویریں لگائی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے کہیں کہیں دیواروں کی فرسودگی پوشیدہ ہو گئی تھی۔

ایک طرف ایک پرانے فریم میں فوٹو بھی آویزاں تھا جس میں بڑے میاں اپنے اچھے زمانے میں کرسی پر بیٹھے اور عمامہ صاف ستھری سفید شیروانی پہنے ہوئے نظر آرہے تھے۔

بڑے میاں کی بیمار بیوی کی شکل سے پتہ چلتا تھا کہ اپنی جوانی کے دنوں میں مہر سے بھی کہیں زیادہ حسین رہی ہوں گی لیکن اب تو وہ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھیں۔ لیٹے لیٹے دو تین باتیں انھوں نے بھی کیں اور ان دونوں کی آمد پر

خوشی کا اظہار کیا۔

میاں بیوی سے اجازت لے کر دونوں جب باہر صحن میں نکلے تو بڑے میاں ساتھ تھے۔

اس وقت صحن میں سے صرف گزر گئے تھے مگر اب صحن میں کھڑے ہو کر بڑے میاں سے باتیں کرتے ہوئے صحن کی حالتِ زار سامنے تھی۔

گھٹا گھٹا سا بند صحن۔

زمین اکھڑی ہوئی کہیں کہیں سے۔

دیواروں کے پاس چاروں طرف سامان رکھا تھا۔ درمیان میں سے کچھ جگہ آمدورفت کے لیے خالی تھی۔

کہیں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا تو کسی طرف بانوں کے جھلنگے پلنگ دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ اور کسی طرف ٹوٹے ہوئے مونڈھوں پر پرانے بستر بچھونے رکھے تھے۔

ایک طرف دو گملوں میں موتیا اور چنبیلی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ کسی کو باغبانی کا بھی شوق ہے۔

چند منٹ کھڑے کھڑے باتیں کیں۔

اور پھر سلام علیکم کر کے منور اور راحت بڑے میاں سے رخصت ہو کر روانہ ہو گئے۔

منور نے محسوس کیا کہ اس ملاقات کا راحت پر بہت اثر ہوا ہے اور وہ پورے راستے خاموش رہا۔ اپنی معنی خیز خاموشی سے چونک کر اس نے

منور سے کہا :

"حضور ! ذرا ٹیکسی بازار کی جانب لے چلیں مجھے کچھ خریداری کرنا ہے ۔"

بازار جا کر اس نے کپڑے کی دکان پر ٹیکسی رکوا دی ۔

دونوں اتر کر ایک دکان کے اندر گئے ۔

منور نے سوچا کچھ اپنے لیے خرید رہا ہوگا ۔ مگر راحت نے زنانہ کپڑا خریدنا شروع کیا ۔

تین شلواروں تین قمیصوں اور تین دوپٹوں کا ریشم ۔

ایک شلوار قمیض اور دوپٹے کا سفید سوتی کپڑا ۔

ایک سلی سلائی نیکر اور قمیض بچّے کی ۔

اور ایک قمیض پاجامے کا مردانہ جوڑا ۔

جب وہ یہ سب خرید چکا تو منور نے حیرانی سے کہا :

"یہ کیا قصّہ ہے بھئی راحت . . . . کس کے لیے تحفے خرید رہے ہو تم ؟"

راحت جواب میں بولا :

"کچھ نہیں یار . . . . بے چارے شرافت علی صاحب کے گھر والوں کی حالت دیکھ کر رحم آیا کہ شریف خاندان کے لوگ کس مصیبت سے دن گزار رہے ہیں ۔ بیٹی کی شادی ہے اور پہننے کو کسی کے پاس کپڑا نہیں ۔ سوچا تفریح میں خرچ کرنے کے بجائے ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کر دوں ۔"

منور نے کہا :

"اوہو! کل تو مجھ پر برس رہے تھے کہ میرے پچاس روپے ضائع کرا دیئے ...... اور آج یہ ......"

راحت نے بات کاٹ کر کہا:

" دیکھا نہیں منور! مہر کتنی حسین ہے مگر اس جوڑے کو روزانہ دھو دھو کر پہنتے ہوئے اس کا رنگ تک اڑ گیا ہے۔ جیا بجا سے سلا ہوا تھا۔ کپڑے میں دم بھی نہیں رہا ہے مگر دوسرا جوڑا نصیب میں نہیں۔ ہم لوگ جو عیش سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور رنگ رلیوں میں فضول روپیہ برباد کرتے ہیں کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچتے کہ ان دکھیارے لوگوں کا کیا حال ہے جو شریف اور کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے مگر انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گئے۔ ہمارے ملک کے لیڈر جو قوم کی بہبود کے لیے روزانہ تقاریر کرتے ہیں وہ صرف الیکشن کے زمانے میں ان غریبوں کے ووٹ کی خاطر آجاتے ہیں بعد کو وہ لوٹ کر خبر بھی نہیں لیتے۔ ملک کی بڑی انجمن کی سماجی خواتین ویسے تو بہت مصروف نظر آتی ہیں اور روزانہ اخباروں میں کسی نہ کسی طور ان کے فوٹو نکلتے رہتے ہیں مگر ان علاقوں کی ان مظلوم لڑکیوں کی طرف ان کی نظر نہیں جاتی کہ کم از کم ان کی شادیاں ہی کرا دیں۔ اب نہ معلوم کون لڑکا قمر کے لیے بمشکل ملا ہے تو جہیز نہ ہونے کی وجہ سے شادی مشکل ہو رہی ہے۔"

باتیں کرتے کرتے دونوں دکان سے باہر آ کر اپنی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

تو منور بولا:

" واقعی راحت ایک ہی واقعہ دیکھ کر عجیب طرح کی کوفت ہو رہی ہے۔۔۔۔ نہ معلوم ایسے کتنے واقعات ہوں گے۔"

راحت کچھ سوچ کر بولا :

" منور در اصل میں نے طے کیا ہے کہ مہر سے میں خود شادی کر لوں ۔ لڑکی میں کوئی برائی نہیں ہے ۔ ذہین ۔۔۔۔ خوب صورت ۔۔۔۔۔ شریف ۔۔۔۔۔ معصوم لڑکی !"

منور نے تعجب سے کہا :

" کیا کہہ رہے ہو راحت اتنی جلدی فیصلہ ؟"

راحت بولا :

" ہاں ہاں ۔ اصل فیصلے تو ایک دم ہی ہوا کرتے ہیں منور ۔"

منور نے مشورہ دیا :

" مگر اپنی امی سے تو پوچھ لو ۔"

راحت نے جواب دیا :

" آج ہی امی کو خط لکھتا ہوں ۔ میری امی فوراً راضی ہو جائیں گی ان کو دولت مند بہو کی کوئی خاص خواہش نہیں ۔ بس جمعہ کو نکاح ہو گا ۔ کل ہی چل کر بڑے میاں کو پیغام دینا ہے ۔ کیا سمجھے ؟ یار ہمارے گھر یہ نہیں ہوتا کہ چھپ کر نکاح ہو اور لڑکی بے چاری امید ہی امید میں بیٹھی رہے ۔"

منور نے ہنس کر کہا :

" اچھا تو کرو تم اپنا نکاح مگر مجھ غریب پر یہ چوٹیں کیوں کر رہے ہو ۔"

اتنی دیر میں ٹیکسی ان کے کمرے پر پہنچ گئی اور سب سامان لے کر دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے۔

منور کو راحت کے فیصلے سے خوشی بھی تھی اور ڈر بھی کہ کہیں راحت کی والدہ انکار نہ کر دیں۔

صبح صبح راحت نے ماں کو ایک لمبا خط لکھا اور ایکسپریس ڈیلی وری سے روانہ کر دیا۔

منور تو اپنے دفتر گیا ہوا تھا۔

دوپہر کو جب وہ واپس آیا تو راحت نے بتایا کہ خط لکھا جا چکا ہے اور آج شام کو پانچ بجے شرافت علی صاحب کے ہاں چلنا ہے۔

کینوس کے ایک بیگ میں سب کپڑے بند کیے گئے اور شام کو پانچ بجے راحت اور منور دونوں شرافت علی صاحب کے گھر پہنچے۔

وہ دل ہی دعا کر رہے تھے کہ خدا کرے کہ بڑے میاں گھر پر موجود ہوں۔

اتفاق سے بڑے میاں گھر پر موجود تھے۔

کنڈی کھٹکھٹانے پر انھوں نے دروازہ کھولا۔

اندر کمرے میں لے جا کر ان کو وہ بٹھانے لگے تو منور نے کہا:

"نہیں آج یہاں باہر صحن ہی میں بیٹھیں گے۔"

دونوں کرسیاں اور ایک مونڈھا جو باہر پڑے تھے ان کو ایک طرف کھسکا کر یہ دونوں بیٹھ گئے۔

بڑے میاں بھی مونڈھے پر ٹک گئے۔

ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

بڑے میاں : صبح سے آج پریشان ہوں۔ کئی روز سے نظیر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے غائب رہنے لگا تھا مگر آج صبح سے غائب ہے بُرے فعلوں میں پڑ جائے گا۔ اس سے تو لڑکیاں ہی اچھی ہیں کہ شرافت سے گھر میں بیٹھی مزدوری کر رہی ہیں۔ ناحق میں نے گود لیا۔ بغیر بیٹے کے اچھا تھا۔"

راحت : اس محلے سے آپ اس کو چلتا کر دیں۔ نہ یہ محلہ ہوگا نہ وہ بُرے فعلوں میں پڑے گا۔"

: (کچھ سوچ کر)

"تو یہ آپ کا بیٹا نہیں ہے گود لیا ہوا ہے؟"

شرافت علی : ہاں بیٹا! گود لیا تھا ... میری بیوی کو بیٹے کی خواہش تھی۔ کراچی میں چند رشتے دار ہیں مگر کوئی بات بھی نہیں پوچھتا اس کو کیا رکھیں گے وہ۔

راحت : آپ میرے ساتھ کر دیں میں کراچی لے جا کر اس کو کسی اسکول میں داخل کرا دوں گا۔ میری امی جان تو اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔

شرافت علی : بیٹے تم بھی کہو گے کس منحوس خاندان سے واسطہ پڑا ہے اپنی جائیں تو پلتی نہیں دوسروں کے بچوں کو گود لیتے پھرتے ہیں۔

راحت : نہیں نہیں ایسا کبھی نہ سوچیے۔ ہم لوگ اب غیر نہیں ہیں

شرافت علی : غیر کیوں ہوئے بیٹے مگر پھر بھی سوچنا تو پڑتا ہے میں نے تو اپنی بیوی کی تسکین کی خاطر کیمپ سے لے لیا

تھا۔ ان کو بیٹا نہ ہونے کا رنج تھا۔

اتنی دیر میں دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔

بڑے میاں نے باہر نکل کر دیکھا۔

تو راحت اور منور کو دروازے پر کچھ شور کی آواز سنائی دی۔

دونوں نکل کر باہر گئے تو دیکھا کہ ایک شریف آدمی پتلون قمیض میں نظیر کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے۔ اور بڑے میاں کو ڈانٹ رہا ہے۔

وہ شخص : تو ایسے ہوتے ہیں شرافت علی نام والے کہ بیٹوں کو لوگوں کی جیب کاٹنے پر چھوڑ دیں۔ ہاں! یہی ہے شرافت تمھاری......؟

بڑے میاں : (نظیر سے مخاطب ہو کر)
کہاں تھا تو صبح سے۔ کیوں پاگل ہوا ہے۔

وہ شخص : اب ایسے بن رہے ہیں جیسے خبر ہی نہ ہو۔ میں تو پولیس میں دے رہا تھا مگر رحم آ گیا۔ سوچا تم کو بتا کر تھانے لے کر جاؤں گا۔ سب بتا دیا ہے اس نے کہ تم اصل باپ نہیں ہو۔ جیب کترا بنانے کو تم نے لیا ہے۔

بڑے میاں پریشان کھڑے تھے۔

منور نے آگے بڑھ کر بات کی۔

منور : جناب میں کیپٹن منور ہوں۔ اور شرافت علی صاحب کو عرصے سے جانتا ہوں۔ واقعہ بتائیے کہ ہوا کیا۔ یہ لڑکا آپ کو کہاں سے ملا ہے؟

وہ شخص : جناب میرا نام لطافت ہے گلبرگ میں رہتا ہوں۔ کسی

کام سے انار کلی میں سے گزر رہا تھا۔ اس لڑکے نے میری پتلون کی پیچھے کی جیب پر ہاتھ ڈالا مگر مجھے پتہ لگ گیا اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس کے ہاتھ میں میرا بٹوہ تھا۔ میں اس کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا کیوں کہ وہاں سڑک پر اتنی ہی دیر میں ہجوم جمع ہونے لگا تھا۔ اس کو میں نے پولیس کی دھمکی دی تو اس نے ڈر کر اپنا پتہ بتا دیا اور اس کی تلاشی لینے پر اس کے پاس سے ایک اور بٹوہ بھی ملا ہے جس میں کچھ کاغذات، ریزگاری اور پندرہ روپے ہیں۔

راحت : بہت بہت شکریہ آپ اس بچے کو یہاں لے آئے تو اس کی زندگی درست ہو جائے گی۔ اگر آپ یہ بات پولیس تک پہنچا دیتے تو اس کی زندگی خوار ہو جاتی۔

لطافت : مگر صاحب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے کہ خود تو یہ بڑے میاں گھر میں بیٹھیں اور لڑکے کو سڑک پر لوگوں کی جیب کاٹنے کو چھوڑ دیں۔

راحت : حضور آپ یقین تو مانیں ہم دو شریف انسان گواہی دے رہے ہیں کہ بڑے میاں کو کچھ بھی نہیں معلوم کہ لڑکا کیا کر رہا ہے۔ ان کی بیوی گھر میں بیمار پڑی ہے اور وہ اپنی ہی مشکل میں مبتلا ہیں۔

لطافت : آپ ذمہ داری لے رہے ہیں تو اس کا بھی انتظام کریں کہ دوسرا بٹوہ جو اس کے پاس ہے وہ بھی جس کا ہے اس کو ملے۔ اس طرح تو میں نہ چھوڑوں گا۔

منور : میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔

بمشکل دونوں نے مل کر معاملہ رفع دفع کرایا۔

لطافت صاحب چلے گئے تو لڑکے کو پکڑ کر بڑے میاں اندر لائے۔ نہ ان میں مارنے کی ہمت تھی نہ رونے کی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

منور نے اندر جا کر بیگ ان کی بیوی کے پاس رکھ دیا اور کہا:

"یہ میرے دوست راحت نے کچھ تحفے آپ لوگوں کو دیئے ہیں۔"

بے چاری کراہتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔

کپڑوں کو نکال کر دیکھنے لگیں۔

ساتھ ہی دعائیں دیتی جاتی تھیں۔

قمر بیٹھی ہوئی مشین پر سلائی کر رہی تھی۔

انھوں نے قمر کو پکارا۔

اور بولیں:

"قمر بیٹی مجھے تو کل ہی یہ جوڑا سی کر پہنا دینا تاکہ مرنے سے پہلے یہ نیا جوڑا پہن لوں۔"

قمر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کپڑے اٹھاتے ہوئے وہ بولی:

"اماں بی ایسی باتیں تو نہ کیا کیجیے۔ اللہ اس گھر میں کبھی خوشی بھی لائے گا۔"

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔

منور نے بڑے میاں سے کہا:

"آپ ذرا ہمارے ساتھ کمرے تک چلیے تو کچھ آپ لوگوں کے متعلق مشورہ کریں۔ لڑکے کو گھر پر چھوڑیئے اب یہ کہیں نہیں

جائے گا۔"

نظیر سے بڑھ کر اس نے کہا :

"میاں صاحب زادے میں فوجی آدمی ہوں۔ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں ورنہ خیر نہیں ہے آپ کی۔ آپ کے دوستوں کو ہم نپٹ لیں گے جنھوں نے یہ ڈھنگ آپ کو سکھائے ہیں۔"

اندر جا کر وہ مہر سے مخاطب ہوا

اور بولا :

"یہ نظیر گھر سے باہر نہ نکلے۔"

پھر ٹیکسی لے کر انارکلی پہنچے اور بٹوہ تھانہ انارکلی کے انسپکٹر کو دے دیا راحت نے رسید لے لی اور بتا دیا کہ راستے میں پڑا ملا ہے۔

بڑے میاں کو لے کر اپنے کمرے پر پہنچے۔

پہلے تو بیرے کو حکم دیا کہ :

"اچھی سی چائے لاؤ۔"

اور تینوں چائے پینے لگے۔

اچھی طرح شرافت علی کی خاطر مدارات کر کر کے ان کو چائے پلائی۔ وہ بیچارے پہلے ہی سخت پریشان تھے پھر مرے پر سَو دُرّے لڑکے کا نیا قصہ ہو گیا۔ وہ بھی ان دونوں کے سامنے ہوا جس سے وہ ان دونوں کی نظروں میں اور حقیر خود کو سمجھنے لگے۔

دورانِ گفتگو میں منور نے کہا :

چھوڑیئے بھی اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے ہو گیا جو ہونا تھا۔ اب تو مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

شرافت علی : کیا سوچوں مستقبل کا ... نہ معلوم تقدیر میں اور کیا کیا ذلت رکھی ہے۔

منوّر : نہیں شرافت صاحب! آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ تقدیر کو درست کرنا بھی انسان کا خود کام ہے۔ آخری وقت تک ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ میں آپ کو یہاں اس لیے لایا ہوں کہ میرے دوست راحت آپ کی صاحب زادی مہر صاحبہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

حیرت سے شرافت علی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
اور گھبرا کر بولے :

شرافت علی : ایں کیا فرمایا ...... مہر ...... میں سمجھا نہیں۔

منوّر : جی ہاں مہر ...... راحت نے اس سال ایم ایس سی کا فائنل امتحان دیا ہے۔ ان کی صرف والدہ ہیں۔ والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ بہن کی شادی ہو چکی ہے۔ ان کے والد حکومت پاکستان کے ملازم تھے۔ اچھے عہدے پر مامور تھے مگر پیسہ کچھ نہیں بنایا صرف ایک کوٹھی چھوڑی ہے وہ ہی ذریعۂ آمدنی ہے۔ اوپر کا حصہ چھ سو روپیہ پر کرائے پر ہے۔ اور نیچے یہ لوگ خود رہتے ہیں۔ یہ بڑے محنتی ہیں انھوں نے اپنی یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ٹیوشن بھی کی۔ نتیجہ اگر اچھا رہا تو اسکالرشپ کی امید ہے اور پھر کہیں باہر مغربی ملک میں تعلیم کے لیے جانا پڑے گا۔ اگر فرسٹ ڈویژن نہ ملی تو پھر کراچی ہی میں ملازمت تلاش کریں گے۔ چار سو تنخواہ تو ایم ایس سی کے بعد مل ہی جائے گی۔

بڑے میاں آنکھیں پھاڑے یہ سب سن رہے تھے۔ آخر بولے۔

شرافت علی : میاں بھلا کیسے یقین کر لوں..... مخمل میں ٹاٹ کا پیوند.... آپ لوگوں کے بزرگ بھلا کیوں راضی ہونے لگے.... کہاں میں کہاں آپ..... اگر میں کر بھی دوں تو لڑکی عمر بھر دکھی رہے گی بیٹا..... آپ کے گھر میں کوئی بھی اس کی عزت نہ کرے گا..... امیروں کے طبقے سے ہم غریب دور ہی اچھے..... اپنی ذراسی عزت وہ بھی چلی جائے گی۔

منوّر : نہیں شرافت صاحب راحت کی والدہ اس خیال کی نہیں ہیں ان کو خط آج لکھ دیا گیا ہے کہ اجازت تار کے ذریعہ دے دیں۔ رخصتی کے وقت وہ خود آکر بیاہ کر آپ کی صاحبزادی کو لے جائیں گی..... غربت کوئی چیز نہیں.... خاندان شریف ہونا چاہیے۔

بڑے میاں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور بولے۔

شرافت علی : بیٹا کیا بتاؤں تقسیم ہند سے بیشتر بریلی میں رہتا تھا اچھی خاصی حیثیت تھی۔ میری بیوی مجھ سے بہتر خاندان کی اور نازوں کی پلی ہوئی ہیں۔ ہم یہاں گردش زمانہ کے چکر میں ہیں.... نہ گھر نہ در..... ملازمت سے بھی پنشن ہو چکی ہے.... برسوں سے بیوی بیمار ہیں جو کچھ سرمایہ تھا علاج پر صرف ہو چکا ہے۔ عزیز رشتہ دار بھی بیگانہ بن گئے.... دوست

احباب راہ میں ملتے ہیں تو نظریں بچا کر نکل جاتے ہیں۔ سچ ہے کوئی بھی بُرے وقت کا ساتھی نہیں۔ یہاں وہ لوگ بھی ہیں جن کو میرے سُسر نے سفارشیں کر کر کے نوکریاں دلائی ہیں اور آج وہ یہاں اچھے اچھے عہدوں پر پہنچے ہوئے ہیں۔

منوّر : انقلابات میں یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آپ رنج نہ کریں۔ اب خدا تعالیٰ نے آپ کے دن پھیر دیئے ہیں۔ ایک اچھا تعلیم یافتہ لڑکا آپ کا داماد ہونے والا ہے۔

(اس نے راحت کی طرف دیکھا)

آپ ہاں کریں تو ہم سب انتظام کریں۔ راحت نے اپنی والدہ کو خط لکھ ہی دیا ہے۔ کل تک تار سے ان کی بھی اجازت آجائے گی۔

شرافت علی : بیٹے ویسے تو یہ مہرو کی خوش نصیبی ہے مگر بس ڈر یہ ہی لگتا ہے کہ میں غریب آدمی ہوں۔

منوّر : کیا باتیں کر رہے ہیں آپ ۔۔۔ وہ تو ہمیں معلوم ہے نا ۔۔۔ ہم پرسوں خاموشی سے نکاح کے لیے آ رہے ہیں۔

شرافت علی : نہ بیٹا ! اتنی جلدی مت کرو ۔۔۔۔ ذرا میں مہر کی ماں سے تو مشورہ کر لوں ۔۔۔۔ پرسوں آپ آجایئے میں آپ کو جواب دے دوں گا ۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ وہ ماں ہیں ان سے اجازت لینا ضروری ہے۔

منوّر : ضرور ضرور آپ ان سے مشورہ لے لیں۔ ان کی رائے اور مرضی بہت ضروری ہے۔

راحت : (جو اتنی دیر سے خاموش تھا)

"آپ بزرگ ہیں جیسی آپ کی رائے ہو بہتر ہے۔"

منور اندر کمرے میں اٹھ کر چلا گیا اور ایک سوٹ کا کپڑا جو اس نے لاہور سے اپنے لیے خریدا تھا لا کر بڑے میاں کو دے دیا۔

منوّر : میری طرف سے یہ قمر کے دولھا کے لیے تحفہ ہے۔

شرافت علی : میاں کہاں تک آپ پورا کریں گے پہلے ہی بے حد احسان ہیں آپ کے۔ اب آپ یہ دئے دے رہے ہیں۔ نہیں نہیں۔۔۔۔

راحت : یہ کپڑا تو کئی روز پیشتر منوّر نے آپ کو دینے کے لیے خریدا تھا۔

منوّر : یہ غلط ہے کہ داماد کو آپ جوڑا نہ دیں۔ رکھیے بھی۔"

مجبوراً شرافت علی نے شکریہ کہہ کر کپڑا لے لیا اور بولے۔

شرافت علی : اس نظیر کا کیا کروں یہ تو یہاں رہ کر بیکار ہوا جا رہا ہے۔

راحت : جی میں نے سوچ لیا ہے۔ میں اس کو کراچی اپنے ہمراہ لے جاؤں گا اور وہاں ملیر میں جامع کے بورڈنگ میں داخل کر دوں گا۔ تاکہ وہاں بورڈنگ میں رہنے سے پابندیاں ہونے کی وجہ سے کہیں باہر نہ جا سکے۔

شرافت علی : بیٹا! آپ کی امّی کیا سوچیں گی۔

راحت : جی ان کو بڑی خوشی ہوگی۔۔۔۔ ہر اتوار کو نظیر ان سے ملنے آیا کرے گا۔

اور چند منٹ بیٹھ کر بڑے میاں رخصت ہو گئے۔
طے ہوا کہ وہ خود پرسوں آ کر جواب دے جائیں گے۔
ان کے جانے کے بعد منوّر نے کہا :

"راحت! آج میں نے تمھارے ابّا جان کی جگہ فرائض ادا کیے ہیں۔ اب ذرا برخوردار ادب کیا کرو۔"

راحت نے بڑے ادب سے کہا :

"ابّا حضور شکریہ!"

اور مزاحیہ جھک کر اس نے تین تسلیمیں کیں۔
دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

اگست کا مہینہ تھا۔

کراچی میں آسمان دھندلا دھندلا ہو رہا تھا۔

فضا ساکن اور درخت میلے میلے نظر آ رہے تھے۔

ایک بار بارش ہو جانے کے باوجود درختوں پر وہ تر و تازگی نہیں تھی، جو پنجاب وغیرہ کی طرف نظر آتی ہے۔

ذکی صاحب دفتر گئے ہوئے تھے۔

بیگم ذکی بھی آج اپنی بہن کے گھر چلی گئی تھیں۔

شہناز کالج گئی ہوئی تھی۔

نورنگ گھر میں اکیلی تھی۔

بوڑھا خانساماں کھانا پکا رہا تھا۔

عبدل بیگم صاحبہ کے ہمراہ گیا ہوا تھا۔

نورنگ شہناز کے کمرے میں ایک آرام کرسی پر لیٹی تھی۔ ایک کتاب اس کے ہاتھ میں تھی جس کو وہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابھی ابھی وہ گھر کی صفائی کا کام ختم کر کے غسل کر کے نکلی تھی۔ اس کے لانبے سیاہ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کھلے بالوں کے درمیان اس کا سرخ و سفید چہرہ بدلی میں چاند کے مثل چمک رہا تھا۔ لیکن خوشی کی بجائے فکر کے آثار سے چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ کتاب کو پڑھ نہیں رہی تھی۔ ورق کھلے ہوئے سامنے تھے

اور خیالات کہیں اور تھے۔

کوٹھی کے سامنے سڑک پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی کسی آنے والے کے پیر کی چاپ سنائی دیتی تھی یا کسی گزرنے والی موٹر کی تیزی سے گزر جانے کی آواز خاموشی میں ایک گھڑگھڑاہٹ سی پیدا کر دیتی تھی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک سبزی فروش کی آواز آتی پھر کسی عورت کی پکار سنائی دیتی تھی کہ:

"سبزی ادھر لانا"۔

نورنگ نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے خیالات کی رَو اس کو ماضی کی طرف لے گئی۔

وہ سوچنے لگی:

"کیا زمانہ تھا.... امّاں بی کا پیار.... ابّا کی نرم ڈانٹ.... بھیّا کی ضدّیں..... گاؤں کی لڑکیوں سے گھر بھرا ہی رہتا تھا..... ہماری استانی جی کتنی اچھی تھیں سب سے گھر کا کام لیتیں مگر مجھ سے کبھی جھاڑو بھی نہ دلواتیں اگر کچھ کام مجھ سے لیتیں تو وہ صرف کپڑوں کی سلائی تھی اس میں انھوں نے پورا سینا پرونا بھی سکھا دیا......
ہم لڑکیاں کبھی کبھی امّاں بی کی اجازت لے کر کھیتوں کی طرف نکل جاتیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے جاتیں اور ہماری اچھی خاصی پکنک سبز لہلہاتے کھیتوں میں ہو جایا کرتی..... روزینہ کتنا اچھا گاتی تھی، اور طاہرہ گاؤں کا ناچ کیسا اچھا جانتی تھی۔ پھر ہم سب

لڑکیاں مل کر کبھی کبھی قوالی کیا کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں
جو نیم کا بڑا سا درخت تھا اس میں جھولا پڑا ہی رہتا تھا
اور ہم لڑکیاں دن رات جھولتی ہی رہتی تھیں...... نیم
کی نمکولیاں ٹپ ٹپ کر ہماری گودمیں گرتی رہتی تھیں۔
چنے کی دال کی روٹی پر گھر کا مکھن کتنا مزا دیتا تھا.....
اوہ خدایا! تیرا شکر ہے تونے آرام سے رکھ چھوڑا
ہے...... بیگم ذکی اور گھر کا ہر آدمی محبت اور عزت
سے دیکھتا ہے...... مگر ہائے اماں بی آپ کو کیا
معلوم آپ کی بیٹی کتنا آپ کو یاد کرتی ہے۔"
(دل میں خیال آیا کہ اماں بی مر نہ گئی ہوں تو اس کے
چہرے پر وحشت برسنے لگی)۔
"اللہ میری اماں جہاں ہوں زندہ ہوں۔
بارِ الٰہا!
ایک بار تو میری اماں کو تو مجھ سے ملا دے۔"
(پھر منور کا خیال آیا اور چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا)
"اونھ..... ہر بار یہ ہی کہہ دیتے ہیں کہ بس ایک
دو مہینے میں سب کچھ ہو جائے گا..... مگر ہو بھی تو
چکے...... نہ معلوم کب آئیں گے...... اب کی بار
سب شکایتیں کروں گی......"
پیروں کی ہلکی سی چاپ نے اس کو چونکا دیا۔
اٹھ کر دروازے کے قریب آئی۔

دیکھا کہ شہناز خراماں خراماں چلی آ رہی ہے۔

اس نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

شہناز نے کتابیں اس کو پکڑا دیں اور خود تھکے ہوئے انداز سے کرسی پر گر پڑی۔

اور بولی :

"اوہ نورنگ اب تو بڑھاپا آگیا تھک جاتے ہیں۔"

نورنگ نے کہا :

"بہت سخت بڑھاپا ہے...... نہ دلہن بنیں...... نہ سہرا بندھا ...... اور ...... بڑھاپا آگیا۔"

شہناز : "جب سے نکاح ہوا ہے شادیوں سے دلچسپی ہوگئی ہے، خود تو پھنس گئیں مجھے بھی پھنسانا چاہتی ہو ....؟"

نورنگ : میں کیا پھنساؤں گی پہلے ہی بندھی ہوئی ہو تم تو۔

شہناز : اچھا میرا ذکر چھوڑو ...... یہ بتاؤ تم کو صنوبر پسند بھی ہے کہ ویسے ہی اقرار کر لیا۔

نورنگ : ہم کیا اور ہماری پسند کیا۔

(اور اس کی آنکھوں میں پریاں ناچنے لگیں)

شہناز : نہیں تم ان کے نام پر خوش ہو جاتی ہو .... کچھ تو ہے ... جس کی پردہ داری ہے۔

نورنگ : پردہ داری کچھ بھی نہیں۔ سوچا .... کب تک بیگم صاحبہ پر بار بنی رہوں گی ..... اماں بی کا ...... اور ..... بھیّا کا کوئی پتہ نہیں لگا .... مجبوراً ہاں کر لی۔

شہناز : لیکن تب بھی صنوبر سے جان پہچان بھی تو کچھ نہیں تھی پہلے .... ایک انجان آدمی کے ساتھ جاکر تم کو کیسا لگے گا .... اب حامد ہی کو لو بچپن سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں ۔

نورنگ : (دل میں آیا کہ حامد کی قلعی کھول دے مگر ٹال گئی)
ٹھیک ہے تمھاری اور بات ہے .... میں جن حالات میں ہوں ان کو دیکھ کر جو کچھ بیگم صاحبہ نے کیا درست کیا ۔

شہناز : اتنی بار تم سے کہہ چکی ہوں تم امّی کو امّی کہا کرو .... بیگم صاحبہ مت کہا کرو ۔

نورنگ : مجھے بیگم صاحبہ کہنا ہی پسند ہے ..... ویسے میں ان کو اپنی امّی سے بھی زیادہ سمجھتی ہوں ۔

شہناز : اچھا تو مطلب یہ کہ تم صنوبر کے لیے خوش ہو ۔

نورنگ : بس ٹھیک ہے مگر اس روز کے بعد سے نہ کوئی خبر ہے اور نہ کوئی اطلاع .....

شہناز : ان ہی باتوں سے تو مجھے ڈر لگتا ہے ۔ شکل سے تو بہت شریف نظر آتے ہیں حضرت .... مگر ڈر یہ ہی ہے کہ کہیں غائب نہ ہو جائیں ..... انسان کا کوئی گھر در بھی تو ہوتا ہے ..... نہ عزیز نہ رشتے دار .... بھئی میں تو سچ کہوں امّی نے جلدی اقرار کر لیا ۔ ذرا دیکھا تو ہوتا ۔

نورنگ : کچھ وجہ ہی ہوگی جلدی اقرار کر لینے کی ۔
(اور اس نے معنی خیز نظروں سے شہناز کی طرف دیکھا مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھی) ۔

حامد صاحب کئی روز سے نہیں آئے ۔۔۔۔ نہ ان کا فون ہی آیا۔"

شہناز : ہاں سنا تھا کسی کام سے پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے

نورنگ ! تم حامد کو کیسا سمجھتی ہو ۔۔۔۔۔ تمھاری کیا رائے ہے ان کے لیے ؟

نورنگ : میں ! میں کیا سمجھتی ۔۔۔۔۔ (حیرت سے) ۔۔۔۔ تم جانو تمھارے بھائی بھی ہیں اور منگیتر بھی۔

شہناز : پھر بھی ۔۔۔۔۔ وہ تو اتنا تمھارا خیال رکھتے ہیں کہ بار بار مجھ سے کہتے ہیں کہ نورنگ کو لے کر چلیں گے۔

نورنگ : عجیب بات ہے ۔۔۔۔ دراصل تو تم دونوں جا رہے ہوں تو تیسرے کو ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تم سے یہ ہی کہنے والی تھی۔ کہ تم ان کو سمجھا دو کہ وہ مجھے لے جانے پر اصرار نہ کیا کریں۔ ویسے بھی مجھے زیادہ جانا آنا پسند نہیں۔

شہناز : کیوں ۔۔۔۔ میں کیوں منع کر دوں ۔۔۔۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔۔۔۔ آخر جب میں خود ساتھ ہوں تو ساتھ جانے میں کیا برائی ہے۔

شرافت علی اپنے مکان میں بنیان پاجامہ پہنے بیٹھے ہیں۔
قمر جھاڑو دے رہی ہے۔
مہر مشین لیے ہوئے ان جوڑوں کو تیار کر رہی ہے جو راحت نے لا کر دیئے ہیں۔
بدر باورچی خانے میں چائے بنا رہی ہے۔
نظیر ایک طرف بیٹھا فرش پر لکھ رہا ہے۔ اسکول کا کام سامنے پھیلا ہوا ہے۔
شرافت علی کی بیوی بستر پر تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی ہیں۔
شرافت علی فکر میں غرق ہیں۔
وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔
بیوی سے بولے :

شرافت : بیوی یہ لوگ تو شریف معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں لڑکے بہت ہی ہمدرد قسم کے ہیں ویسے راحت میاں نے ایم اے فائنل کر لیا ہے۔ مکان بھی اپنا ذاتی ہی ہے۔

بیوی : مگر بھئی ہم غریب آدمی ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ بعد کو طعنے ملیں گے

شرافت : بیوی سوچ لو بار بار ایسے موقعے نہیں ملا کرتے ...... لڑکا بے حد شریف ہے۔ بتا رہا تھا کہ میری والدہ ایسی نہیں ہیں کہ حقارت سے دیکھیں۔

بیوی : ویسے تو اپنی بیماری کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ بہتر ہو کہ
میری زندگی ہی میں دونوں کا ہو جائے۔"
(آنکھوں میں آنسو آگئے)
دروازے پر کھٹکا ہوا۔
نظیر نے دوڑ کر جا کر دیکھا۔
واپس آکر بولا :

نظیر : "منور صاحب اور راحت صاحب آئے ہیں۔"
بڑے میاں نے اٹھ کر کرسیاں ڈالیں۔
اور نظیر سے کہا :

شرافت علی : "اندر بلا لاؤ۔"
مہر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔
منور اور راحت نے اندر آکر بیک زبان کہا :

منور، راحت : "السّلام علیکم!"

شرافت علی : سلام علیکم ..... تشریف رکھیے۔
بڑے میاں کی بیوی کو بھی دونوں نے سلام کیا اور ان کی
مزاج پرسی کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

منوّر : (جیب سے ایکسپریس خط نکال کر شرافت علی کے ہاتھ
میں دیتے ہوئے)
یہ خط راحت کی والدہ کا آگیا ہے۔
شرافت علی نے خط لے لیا۔
اور کھول کر پڑھنے لگے۔

لکھا تھا :

"پیارے بیٹے راحت !

دعائیں۔

مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے لیے دلہن کا انتخاب کر لیا ہے۔ میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ منور کی رائے درست ہے نکاح کی رسم ادا کر لو شادی کی تاریخ بعد میں مقرر ہوگی۔ انتظام کر کے میں خود ٹھیرالوں گی۔ لڑکی شریف ہونی چاہیے دولت کا کیا کرنا ہے۔ خدا تم کو اس لائق کرے کہ تم کما کر اس کو آرام سے رکھ سکو۔ لڑکوں میں کمانے کی صلاحیت ہونا چاہیے۔ جہیز کتنے دن کام دیتا ہے۔ نکاح کی تاریخ سے تار سے اطلاع دے دینا۔ پانچ سو روپیہ بذریعہ تار روانہ ہے۔

دوسرا خط شرافت صاحب کو دے دینا۔

فقط :

تمھاری ماں"

شرافت علی کے نام کا خط یہ تھا :

"محترمی شرافت علی صاحب !

السلام علیکم۔

میں آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔

افسوس کہ راحت کے والد کا انتقال ہو گیا ہے

دراصل یہ خط اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کی طرف سے جاتا۔

میں آپ کی بیٹی مہر کے لیے اپنے بیٹے راحت کے رشتے کی خواستگار ہوں۔ راحت نے اپنا پورا حال بتا دیا ہوگا امید کہ لڑکا آپ کو پسند ہوگا۔ آپ اگر نکاح کی تاریخ مقرر کر کے نکاح کر دیں تو مشکور ہوں گی۔

اس وقت راحت کے بزرگ بھی آپ ہی ہیں رخصتی کا انتظام میں خود کر لوں گی۔

آپ اب راحت کے باپ کی جگہ ہیں آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

میں رخصتی اس وقت کروں گی جب کہ راحت کو ملازمت مل جائے۔ ویسے تو مہر میرے لیے بیٹی کی طرح ہے مگر تب بھی لڑکی کو اصلی خوشی جب ہی میسر ہوتی ہے جب اس کا میاں خود کما رہا ہو۔ دو تین ماہ کے اندر اللہ نے چاہا تو ملازمت مل جائے گی۔

مخلص :

والدۂ راحت"

بڑے میاں نے دونوں خط پڑھے۔ اور منور کی طرف دیکھنے لگے۔

منوّر : آج پیر کا روز ہے۔ میری رائے میں جمعہ کے روز شام کو چھ بجے نکاح ہو جائے۔

شرافت علی : بہتر ہے۔ آپ کتنے لوگ آئیں گے۔ چائے وغیرہ آپ یہاں ہی پئیں۔

منوّر : جی میں.... راحت.... ایک قاضی صاحب... اور میرے دو دوست.... بس ہم پانچ آدمی ہوں گے۔

راحت : جی چائے کا سامان میں جمعہ کی صبح کو خود آ کر رکھ جاؤں گا آپ کچھ نہ منگائیں۔

شرافت علی : بہتر ہے۔

راحت : میں آئندہ پیر کو واپس کراچی جا رہا ہوں نظیر کو میں ساتھ لے جاؤں گا۔
(شرافت علی کی بیوی سے)۔
کیوں اماں جی آپ کی اجازت ہے نا ؟

بیگم شرافت : ہاں بیٹا ضرور لے جاؤ۔ میں جب سے پڑی ہوں یہ غلط صحبت میں پڑ گیا ہے۔ وہاں سختی سے نگاہ رکھنا۔

بدرہ ایک پرانی سی کشتی میں تین پیالیوں میں چائے بنا کر لے آئی۔ اور اسٹول پر درمیان میں رکھ دی۔

راحت نے کہا :

" اماں جی آپ اطمینان رکھیں یہ وہاں امّی جان کے سپرد کر دیئے جائیں گے وہ خود دیکھ بھال کر لیں گی۔

تینوں نے چائے پی اور اجازت لی۔

شرافت علی دروازے تک چھوڑنے آئے۔

دونوں دوست دوسرے روز بازار گئے۔
وہاں ایک انگوٹھی خریدی ڈھائی سو روپیہ کی۔
ایک بنارسی ساڑھی اور بلاؤز دو سو میں لیا۔
ایک جوڑا سنہری چپل کا خریدا۔
باقی تینس روپے نکاح کے روز کے لیے چائے کا سامان لینے کے لیے محفوظ رکھ لیے۔۔۔۔۔

اور یہ ساڑھی بلاؤز پیٹی کوٹ جاکر راحت خود ہی دے آیا۔ اور تاکید کر دی کہ بلاؤز اور پیٹی کوٹ تیار کر لیا جائے۔ اور نکاح کے روز پہنا دیا جائے۔
جمعہ کے روز صبح صبح چائے کا سامان اور چائے کے چھ نئے کپ اور چھ کوارٹر پلیٹ اور چھ ہاف پلیٹ بھی اس کے ساتھ راحت نے صبح صبح پہنچا دیں۔
شام کو منوّر، راحت، منور کے دو دوست کیپٹن ثروت اور کیپٹن علی مع قاضی صاحب کے پہنچ گئے۔
بڑے میاں نے پڑوس سے کرسیاں مانگ کر آنگن میں بچھا دی تھیں اور ایک طرف میز ڈال کر چائے کا سامان چن دیا تھا۔ اس پر جالی کا سفید دوپٹہ ڈھکا ہوا تھا
چھ بجے جیسے ہی یہ لوگ پہنچے۔
قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔

اس کے بعد چائے ہوئی۔

کمرے کے دروازے پر آج پردہ پڑا ہوا تھا۔ تاکہ باہر کا سامنا نہ ہو۔ راحت نے شرافت علی سے کہا :

"میں ذرا اندر جا کر اماں کو سلام کروں گا۔"

"منور" آہستہ سے بولا :

"اور یہ مہر کو انگوٹھی بھی خود ہی پہنانا چاہتے ہیں۔"

شرافت علی راحت کو لے کر اندر کمرے میں گئے۔

بڑی بی کو راحت نے سلام کیا۔

وہ بے چاری دعائیں دینے لگیں۔

مہر اور بدر پاس کھڑی تھیں۔

مہر کی نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں اور سرخ بنارسی ساڑھی میں اس کی گوری شکل اور بھی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ دراصل آج اس کے حسن کو یہ ساڑھی بے نقاب کر رہی تھی۔ شرم سے اس کے رخسار گلابی ہو گئے تھے بس پلکیں نیچے جھکی ہوئی اس کی نرگسی آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھیں۔

آگے بڑھ کر بڑے میاں نے بیٹی کا ہاتھ راحت کے ہاتھ میں دے دیا اور نم آلود آنکھوں کو اس کی طرف اٹھا کر بولے :

"بیٹی ! میں نے تم کو آج راحت میاں کو دے دیا اب ان کی خوشی ہی تمھارا فرض ہے۔"

راحت نے اس کا سفید کانپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یاقوت کی سرخ نگینے والی انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں پہنا دی۔

پھر کہنے لگا :

راحت : یہ تو رسمی طریقے پر جلدی میں خرید لی ہے۔ اماں بی اصل سامان تو خود دیں گی۔

شرافت علی : بیٹے ایسی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔

بیگم شرافت علی : نہیں نہیں .... یہ تو شگون کی چیز ہے اچھا کیا کہ آج یہ تم نے پہنا دی.... اللہ مبارک کرے..... دودھوں نہاؤ بیٹا پوتوں پھلو.....

راحت نے ایک نظر مہر پر ڈالی۔

شرافت علی باہر جا چکے تھے۔

وہ اس وقت کھلے بندوں ماں اور بہن کے سامنے اس کے پُر وقار حسن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ اب تک اس کا نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہی ہے۔

اور مہر نے بھی اس کو چھڑانے کی کوشش نہ کی تھی۔ باوجود شرم کے اور جھکی ہوئی نظروں کے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

بدر نے یہ کیفیت تاڑلی۔

اور راحت سے بولی :

"اللہ راحت بھائی..... آپ ہم سے تو بات ہی نہیں کرتے.... ہم کب سے آپ کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔"

راحت نے گھبرا کر مہر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اور کہنے لگا :

"اوہ..... مجھے تو خیال ہی نہیں تھا.... کہ تم مجھ سے بات کرنا چاہتی ہو۔"

بدر بولی :

" ہم نے بھی تو کراچی نہیں دیکھا ہے راحت بھائی.... نظیر کو تو آپ لیے جا رہے ہیں۔"

راحت نے جواب دیا :

" چند ماہ بعد تم بھی مہر کے ساتھ ہی کراچی جاؤ گی - اطمینان رکھو اب تو کراچی تمھارا گھر ہی ہوگا..... قمر کدھر ہے ؟"

بدر نے بتایا :

" وہ چائے کا انتظام کر رہی ہیں۔"

راحت نے مسکرا کر کہا :

" انھیں میرا سلام کہہ دینا۔"

اور وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

شبنم کی شادی کی دھوم دھام تھی۔
سعادت صاحب کی حسین کوٹھی کے لان پر شامیانہ لگا ہوا تھا۔
شہ نشین پر کارچوبی مسند اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔
پوری کوٹھی کو برقی قمقموں سے آراستہ کیا ہوا تھا۔
دروازے پر چند نوجوان اعلیٰ درجے کے قیمتی سوٹ پہنے کھڑے ہوئے مہمانوں کی آمد کے منتظر تھے۔
دلہن کی طرف کے مہمان جمع ہو چکے تھے۔
برات کی آمد کا انتظار تھا۔
سامنے سے خالدہ اونچے بال بنائے سلیولس بلاؤز کے ساتھ بنارسی آسمانی رنگ کی ساڑھی باندھے دس پندرہ حسین لڑکیوں کو ساتھ لیے نکلی۔ گلے میں نیلم اور موتی کا چوڑا سا جڑاؤ گلوبند تھا اور کانوں میں نیلم اور موتی کی جڑاؤ بجلیاں۔ ایک ہاتھ بالکل ننگا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں صرف گھڑی تھی۔ گھڑی پر بھی نیلم جڑے ہوئے تھے۔
ان سب لڑکیوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔
ان کی آمد سے قہقہے اور ترنم ریز آوازیں فضا میں گونج پیدا کر رہی تھیں۔
نوعمر لڑکے سب ایک لائن میں ہو گئے۔
اور لڑکیاں ان کے سامنے دوسری لائن میں کھڑی ہو گئیں جن کی سربراہ خالدہ

تھی۔ وہ آج بہت خوش تھی کہ اس کی دوست کی شادی ہے مگر دل ہی دل میں وہ جز بز بھی تھی کیونکہ منوّر نہیں آیا تھا۔ اور اس نے لکھ بھیجا تھا کہ چھٹی منظور نہیں ہو سکی۔

اس نے اچٹتی ہوئی نظر سامنے کھڑے ہوئے لڑکوں پر ڈالی اور برابر کھڑی ہوئی لڑکی سے بولی:

"روحی کتنی عجیب بات ہے کہ منوّر کو چھٹی نہیں ملی ..... ہی اِز اِن دی آرمی ..."

روحی نے جواب دیا:

"ہاں ہاں خالدہ ..... اِن دی آرمی اِٹ اِز ویری ڈیفی کلٹ ....."

مریم (تیسری لڑکی) بولی:

"تو کیا ہوا .... اِٹ اِز ناٹ منوّرز میرج ...."

خالدہ نے کہا:

"پھر بھی بھائی بہن کی شادی میں نہ آ سکے۔"

سامنے سے برات آتی نظر آئی اور سب لڑکیاں اور لڑکے ادھر متوجہ ہو گئے خالدہ نے اپنے سر و پا پر نظر ڈالی اور اپنی خوب صورت ساڑھی کو درست کیا۔ اس نے ساڑھی کے پلّے کو جو لٹک رہا تھا اپنے بازو پر لے لیا اور اس کا سفید پیٹ اور ننگی کمر صاف نظر آنے لگے۔ بلاؤز کے گلے میں سے گول خم دار چھاتیاں اپنے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نمایاں تھیں اور درمیان کی باریک لکیر جھلک رہی تھی۔

دولہا چند دوستوں کے ہمراہ جو اس کو پکڑے ہوئے تھے زربفت کی شیروانی اور بنارسی صافہ پہنے سہرا باندھے نظر آیا۔

خالدہ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا :

"ہاؤ وانڈر فُل"۔

اس نے آگے بڑھ کر دولہا کو موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کا گجرا پہنا دیا۔ لڑکیوں نے اس کے ساتھ کے لڑکوں کے گلوں میں ہار ڈال دیئے۔

عورتیں اور مرد براتی آتے رہے۔

اور یہ لوگ ان کا استقبال کرتے رہے۔

لڑکیاں ہار پہناتیں۔

اور لڑکے لے جا لے جا کر ان کو صوفوں پر بٹھا دیتے۔

جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تو قاضی صاحب نے نکاح نامے پر دستخط لے کر خطبہ پڑھا اور پنڈال میں مبارک سلامت کی دھوم مچ گئی۔

اب مہمانوں کو پنڈال کی دوسری جانب لے جایا گیا جہاں کھانے پینے کی اشیاء چنی ہوئی تھیں۔

ایک گھنٹے تک مہمان کھانے پینے میں لگے رہے۔

لڑکیاں اندر شبنم کو تیار کر رہی تھیں۔

وہ خود بھی اپنی آرائش میں حصہ لے رہی تھی۔

کمرہ اندر سے بند تھا اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔

ری سیپشن کے ختم ہوتے ہی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

دولہا کو آرسی مصحف کے لیے اندر بلایا گیا۔ دولہا کی بہنیں آ کر اس کو اندر لے گئیں۔ اندر کمرے میں مسند پر دلہن پہلے سے تیار گھونگھٹ لگائے بیٹھی تھی۔

دلہن کے سامنے دلہا کو بٹھا دیا گیا۔

قرآن شریف اور آئینہ ایک بیگم صاحبہ نے سامنے رکھ دیا اور آرسی مصحف

کی رسم ادا ہونے لگی۔

خالدہ دلہن کو لیے بیٹھی تھی۔

خدیجہ بیگم بھتیجی کی شادی کے اہتمام میں لگی ہوئی تھیں وہ بھی اس وقت دولہا کو دیکھنے اور سلامی دینے کی وجہ سے آکر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھیں۔ دولہا دلہن پر سے نظر ہٹ کر ان کی نظر ان لڑکیوں پر پڑی جو دولہا کے ہمراہ تھیں۔ ایک لڑکی پر ان کی نظر ٹھیر گئی اور وہ پہلے تو بہت غور سے اس لڑکی کو دیکھتی رہیں۔ لڑکی اپنے ساتھ والی لڑکی سے گفت گو کرنے میں محو تھی۔ وہ ہلکا آسمانی رنگ کا غرارہ اور اسی رنگ کا ریشمی قمیض دوپٹہ پہنے تھی۔ میک اپ سے اس کا چہرہ خالی تھا اور کسی قسم کا زیور بھی گلے یا کانوں میں نہ تھا۔

خدیجہ بیگم نے بڑی دیر تک اس لڑکی کو دیکھا۔

اور پھر مجمع کو چیرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دم لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

وہ بھونچکّا ہو کر انھیں دیکھنے لگی۔

اور خدیجہ بیگم نے اس کو کھینچ کر گلے سے لپٹا لیا۔ اور ....

"میری نورد ..... میری بچّی ....."

ان کے منہ سے نکلا۔

مجمع میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔

اور تعجّب سے عورتیں ان کو دیکھنے لگیں۔

لڑکی نے بھی جیسے ہی ان کو دیکھا۔ چیخ مار کر ان سے لپٹ گئی۔ اور اس کے منہ سے بمشکل نکلا:

"ہائے میری امّی ......"

اور وہ دونوں زار وقطار رونے لگیں۔

یہ لڑکی دراصل نورنگ تھی جو کرن لگے ہوئے آسمانی دوپٹے میں اپنی سادگی کے باوجود حور معلوم ہو رہی تھی اور حسین لڑکی سے وہ باتیں کر رہی تھی وہ شہناز تھی۔

شہناز نے دونوں کو الگ کیا۔

نورنگ نے رو رو کر بتایا :

" شہناز ! یہ میری امّی ہیں۔"

شہناز گھبرا کر بولی :

" تم یہیں ٹھیرو میں امّی کو تلاش کر کے لاتی ہوں۔"

اتنی دیر میں یہ خبر پورے گھر میں مشہور ہو چکی تھی اور پوری برات کے لوگ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتے تھے جو لوٹیں اپنی ماں کو اچانک مل گئی تھی۔

شہناز نے آکر آہستہ سے ماں کے کان میں کچھ کہا۔ وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ کر فوراً اندر چلی گئیں۔

وہاں شہناز نے ان کو خدیجہ بیگم سے ملایا کہ :

" یہ نورنگ کی امّی ہیں۔"

نورنگ نے بے حد پیار سے بیگم ذکی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

اور بولی :

" امّی جان میری امّی مل گئیں۔"

بیگم ذکی نے خدیجہ بیگم سے کہا :

" اے بہن ! اتنے روز سے آپ کہاں تھیں ؟"

خدیجہ بیگم نے جواب دیا :

"ہوتی کہاں بُوا.... یہ سعادت جن کی بیٹی کی یہ شادی ہے یہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔ لُٹ لٹا کر ان کو ڈھونڈتی کراچی پہنچی جب سے ان ہی کے پاس ہوں۔"

بیگم ذکی نے جب یہ سنا کہ خدیجہ بیگم سعادت صاحب کی بہن ہے تو ان کی نیچے کی سانس نیچے اور اوپر کی سانس اوپر رہ گئی اور وہ سراسیمہ ہو کر خدیجہ بیگم کا منہ تکنے لگیں۔

کیوں کہ ان کو فوراً یہ خیال آیا کہ انھوں نے اتنے عالی خاندان کی لڑکی کا نکاح ایک معمولی آدمی سے کر دیا ہے اب اگر ان لوگوں کو معلوم ہوا تو یہ لوگ تو جان کو آ جائیں گے۔

یہاں یہ قصّہ پیش تھا۔

باہر سے شبنم کی رخصتی کے تقاضے آ رہے تھے۔

بیگم سعادت نے نند کو اور نورنگ کو الگ لے جا کر ایک کمرے میں بٹھا دیا اور کہنے لگیں :

"آپ یہاں اپنی بچّی سے باتیں کریں میں ذرا شبنم کو رخصت کرا دوں۔"

شبنم گھنٹہ بھر کے اندر رخصت ہو کر اپنے دولہا کے ساتھ چلی گئی۔

برات بھی رخصت ہو گئی۔

مگر بیگم ذکی اور شہناز ابھی واپس نہ گئیں۔

بیگم ذکی نے ذکی صاحب کو ایک طرف بلا کر پورا قصہ بتایا۔

اور کہنے لگیں :

"اب میں کیا کروں اور کس منہ سے کہوں کہ تمھاری بیٹی کا نکاح میں نے کر دیا ہے۔"

ذکی صاحب نے جواب دیا :

"بیگم گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے وہ ہی کوئی شکل نکالے گا۔ ہم نے کسی برائی سے تو نکاح کیا نہیں تھا۔ فی الحال ذکر مت کرو، اور نورنگ کو بھی الگ بلا کر سمجھادو کہ وہ ابھی اپنے نکاح کا تذکرہ ہرگز نہ کرے..... ہم خود ہی سوچ سمجھ کر کہہ دیں گے۔"

بیگم ذکی بولیں :

"تو آپ سے ملنے کے بہانے اس کو بلا لیتی ہوں۔ وہ لوگ اب واپس اس کو جانے نہ دیں گے۔"

(شہناز سے) :

"بیٹی ذرا بلانا تو نورنگ کو..... کہنا ابو ملنا چاہتے ہیں۔"

چند منٹ میں شہناز اور نورنگ آتی نظر آئیں۔ ذکی صاحب نے قریب بلا کر سر پر ہاتھ رکھا اور بہت محبت سے کہنے لگے :

"نورنگ بیٹی مبارک ہو تمھاری ماں مل گئیں مگر اصلی ماں کو پاکر ان ماں کو نہ بھول جانا ان کو تم سے بے حد محبت ہے۔"

نورنگ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور وہ بولی :

"بابا! یہ کیسے ہو سکتا ہے اتنے پیار سے امی جان نے مجھے رکھا ہے......"

ذکی صاحب نے کہا :

"ایک میری نصیحت بھی ہے بیٹی کہ تم ابھی یہاں اپنے نکاح کا ذکر نہ

کرنا کیوں کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ تم کس خاندان سے ہو، اور غلطی سے صنوبر سے نکاح ہو گیا جو کسی طرح بھی سعادت صاحب کے خاندان کی برابری نہیں کر سکتا۔"

نورنگ یہ سن کر گھبرا سی گئی۔

اور بولی:

"جی..... ؟"

ذکی صاحب نے کہا:

"ہاں بیٹی ہم کوشش کریں گے کہ وہ کچھ رقم لے کر خاموشی سے طلاق نامہ لکھ دے۔ ویسے وہ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے.... امید ہے مان لے گا۔"

پھر اپنی بیگم سے بولے:

"اچھا بیگم! نورنگ کو ان کی والدہ کے سپرد کرو.... اور چلو۔"

بیگم ذکی، نورنگ اور شہناز، خدیجہ بیگم کے پاس آئیں اور بیگم ذکی نے ان سے کہا:

"بہن آپ کو آپ کی بیٹی مبارک۔ میں نورنگ کو آپ کے حوالے کر رہی ہوں..... مگر یہ خیال رکھیں کہ نورنگ میری بھی بیٹی ہے اور مجھے اس سے ایسی ہی محبت ہے جیسی شہناز سے۔"

خدیجہ بیگم نے جواب دیا:

"کیوں نہیں بہن آپ نے جس محبت سے اس کو رکھا ہے وہ سب بتا رہی تھی ابھی مجھے... کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔"

بیگم سعادت بولیں:

" بہن! جب آپ کا دل ہو نورنگ کو بلا لیا کریں..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

بیگم ذکی نے کہا:

" اچھا بہن خدا حافظ..... اب تو جا رہی ہوں کل آکر نورنگ کو ذرا گھر لے جاؤں گی..... تاکہ وہ اپنا جو کچھ سامان ہے وہ لے آئے۔"

خدیجہ بیگم بولیں:

" اے آپ کا گھر ہے بہن جب دل ہو آئیے۔"

لیکن خدیجہ بیگم نے دیکھا کہ ذکی صاحب سے مل کر نورنگ واپس لوٹی تو وہ کچھ مرجھائی ہوئی سی تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ ان لوگوں نے محبّت سے رکھا ہے اس لیے یہ چیز بھی کچھ تکلیف دِہ ہے کہ ان لوگوں کو ایک دم چھوڑ دیا جائے۔ ایک بار تو ان کا دل چاہا کہ وہ نورنگ کو بیگم ذکی کے ساتھ واپس جانے دیں مگر پھر اپنی ممتا سے مجبور ہو کر وہ بیگم ذکی سے لپٹ گئیں اور رِقّت آمیز آواز میں بولیں:

" بہن کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔"

تھوڑی دیر بیگم ذکی اور خدیجہ بیگم گلے مل کر روتی رہیں۔

اور پھر خدیجہ بیگم سے اجازت لے کر بیگم ذکی شہناز کو لے کر ذکی صاحب کے ساتھ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئیں۔

شبنم کا کمرہ اب سعادت صاحب کے حکم سے نورنگ کے لیے آراستہ ہو چکا تھا۔ اس کو نیلا رنگ پسند تھا اور اس کمرے پہ نیلے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے جن پر سفید پھول بڑے ہوئے تھے۔

خوب صورت مسہری پہ ہلکے نیلے رنگ کی چادر اور نیلے رنگ کے تکیے لگے ہوئے تھے۔

ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل پر قسم قسم کی شیشیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ ایک نیلی سٹیل کی الماری جس میں اس کے لباس بند تھے ایک طرف کھڑی تھی۔

کونے میں چھوٹی میز پر نیلا ہی میز پوش پڑا تھا جس پر نیلا بلور کا گلدان رکھا تھا اور اس میں سفید چنبیلی کے پھولوں کی ٹہنیاں بھری ہوئی تھیں جن کی خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

نورنگ خود بھی ہلکے نیلے رنگ کا سلیپنگ سوٹ پہنے مسہری پہ دراز تھی اس کے سرہانے برقی لیمپ جل رہا تھا جس کا گلوب بھی نیلا تھا اور اس کی وجہ سے برقی روشنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

ایک ہلکا پھلکا انگریزی رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا جس کی وہ ورق گردانی کر رہی تھی کیوں کہ اس نے شہناز سے کچھ انگریزی سیکھ لی تھی اور سعادت صاحب نے اب ایک خاتون کو پڑھانے پر مقرر کر دیا تھا۔

رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا مگر دھیان کہیں اور تھا اور خیالات کی دنیا

میں کھوئی کھوئی سی وہ دیوار پر لگی ہوئی اس پینٹنگ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جس میں ایک حسین لڑکی نیلے سمندر کی موجوں کو کنارے پر بیٹھی دیکھ رہی تھی - وہ دل ہی دل میں اپنے مستقبل کو سوچ رہی تھی :

"کتنا اچھا ہوا کہ اماّں بی مل گئیں . . . . کتنی خوش نصیب ہوں میں . . . . . بیگم ذکی بے چاری کو بہت دکھ ہوا مجھے چھوڑتے ہوئے . . . . . شہناز کتنی پیاری ہے وہ . . . . . حامد کی باتوں کو کبھی اس نے غور ہی نہ کیا بڑی صاف دل ہے . . . . . وہ تو سب ہی لوگ اچھے ہیں . . . . . مگر یہ شبنم جب آتی ہے عجیب نظروں سے گھورتی ہے نہ معلوم کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو . . . . . بیگم سعادت بھی ایسے خلوص سے مجھے نہیں رکھتیں جیسے کہ بیگم ذکی رکھتی تھیں . . . . . مگر ماموں سعادت بڑے پیارے سے ہیں جب تک میز پر میں نہ پہنچوں کھانا ہی نہیں کھاتے اور کتنے پیار سے باتیں کرتے ہیں -

مگر صنوبر نہ معلوم کہاں ہے اس کو کچھ بھی تو نہیں معلوم . . . . . اس کا دوست راحت بھی غائب ہو گیا ہے . . . . مگر ان لوگوں کو کیا خبر کہ میں یہاں ہوں . . . . صنوبر اگر آیا تو بیگم ذکی سے ضرور ملے گا . . . . . مگر سعادت صاحب کیوں کرنے لگے اب اس سے شادی . . . . . اللہ اگر بیگم ذکی طلاق مانگنے سے پہلے سعادت صاحب سے بات کر لیں تو کیا ہرج ہے . . . . . شاید

وہ کسی اچھی جگہ نوکری دلوادیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے لوگ تو اپنے رشتہ داروں کو اچھی جگہوں پر لگوا دیتے ہیں خواہ وہ میٹرک ہی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کو بتا دینے میں کیا ہرج ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بیگم ذکی نے تو سخت تاکید کردی ہے کہ ہرگز نہ بتانا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ یہ بھی تو بتا رہا تھا کہ کوئی سعادت صاحب ہیں ان کے ہاں میں ڈرائیور ہوں شروع میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہیں یہ وہی سعادت صاحب تو نہیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ایسا ہے تو وہ ہرگز نہ مانیں گے کہ ان کی بھانجی کی شادی ان کے ڈرائیور سے ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ کیسی گتھی پڑگئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اف صنوبر میں کیا کروں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے بغیر میں کیا کروں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے تو دل میں تمھاری یاد کو اس طرح بسا لیا ہے کہ جیسے میری زندگی کا۔ ۔ ۔ ۔ دار و مدار ہی اس یاد پر ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں کس طرح یہ سوچوں کہ تمھاری جگہ کوئی دوسرا لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ صنوبر کے آنے پر میں پہلے اس سے مل لوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بعد کو بیگم ذکی اس سے ملیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر کیسے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ اس کو یہ گھر معلوم نہ مجھے اس کا پتہ معلوم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راحت کا گھر بھی تو نہیں معلوم جو کسی طرح اس کو ہی حال بتا دوں۔ ۔ ۔ ۔ خدایا میں نے تو سوچا تھا کہ امی کے ملنے سے میری تمام مشکلات

ختم ہو جائیں گی ...... مگر وہ تو اور بڑھ گئیں ....
کل اگر میں جاکر شہناز سے مل آؤں تو کچھ مشورہ ہم
دونوں آپس میں کر سکیں ....."

سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں نیند آنے لگی اور اس نے سرہانے رکھے ہوئے لیمپ کا بٹن آہستہ سے دبا دیا۔
اور سو گئی۔

صبح دوسرے روز چائے کی میز پر ناشتہ کرتے ہوئے اس نے خدیجہ بیگم اور سعادت صاحب سے ذکی صاحب کے گھر جانے کی اجازت لے لی کہ ڈرائیور اس کو دوپہر کے کھانے کے بعد وہاں چھوڑ آئے گا۔ وہ بے چینی سے دوپہر کے کھانے کا انتظار کرنے لگی۔

اب وہ کبھی کبھی ساڑھی بھی پہن لیتی تھی۔

اس نے آج ہلکی گلابی رنگ کی نائلان کی سادی ساڑھی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہنا، تاکہ بیگم ذکی خوش ہوں کہ ان کی بیٹی ساڑھی پہننے لگی ہے۔ بالوں کو اس نے سادگی سے کنگھی کر کے چوٹی گوندھ لی۔

مگر یہ گلابی ساڑھی اس کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے کافی تھی۔

کھانا ختم ہوتے ہی اس نے گاڑی نکلوائی اور ڈرائیور سے ذکی صاحب کی کوٹھی پر جانے کے لیے کہا۔

وہ گرو مندر ہوتی ہوئی ناظم آباد والی سڑک پر گزر رہی تھی۔ اس کے خیالات میں ذکی صاحب کا گھر تھا جہاں وہ اتنے دنوں رہ چکی تھی۔

تھوڑی دیر میں گاڑی کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو چکی تھی۔

وہ خوشی خوشی اتری۔

اور شہناز کے کمرے کی طرف چل دی۔

اس کو اطلاع کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر پھر اس کو خیال ہوا کہ پہلے بیگم ذکی کو سلام تو کرے۔

وہ ان کی آواز سنتی ہوئی برآمدے کی طرف چلی گئی جہاں بیگم ذکی نوکر کو ہدایتیں دے رہی تھیں۔

نورنگ نے جاتے ہی کہا :

"امّی جان سلام علیکم !"

بیگم ذکی بولیں :

"اچھا بیٹی نورنگ جیتی رہو..... کیسی ہو.... کب آئیں ؟"

نورنگ نے جواب دیا :

"ابھی آئی امّی جان..... اچھی ہوں.... آپ کے مزاج کیسے ہیں.... شہناز کہاں ہیں ؟"

بیگم ذکی نے کہا :

"اپنے کمرے میں ہوں گی۔"

نورنگ بولی :

"ابھی آپ کے پاس حاضر ہوتی ہوں ذرا ان سے مل لوں کہیں وہ شام کو باہر نہ جا رہی ہوں۔"

یہ کہتی ہوئی وہ شہناز کے کمرے کی طرف چل دی۔

اور اندر گھس کر شہناز سے لپٹ گئی جو کھڑی ہوئی بے خیالی میں آئینے

میں خود کو دیکھ رہی تھی۔

شہناز : اری بگلی کیا ہو گیا.... ایسی لیٹی ہے جیسے برسوں کی چھوٹی ہوئی ہو۔

نورنگ : اور نہیں تو کیا...... تم سے چھوٹ کر عجب طرح سے بور ہو رہی ہوں..... وہاں نہ کوئی بات کرنے والا ہے اور نہ بے تکلف کوئی سہیلی ہے۔

شہناز : کیوں شبنم جو آتی رہتی ہے۔

نورنگ : جی ہاں شبنم ! اس کے کمرے میں جو مجھے سعادت ماموں نے رکھ دیا ہے تو وہ مجھ سے جب آتی ہے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتی ہے۔

شہناز : اچھا چلو بیٹھ کر باتیں کریں پوری دوپہر پڑی ہے جتنی باتیں دل چاہو کر لینا مگر یہ خیال رہے کہ پانچ بجے حامد آرہے ہیں اور ان کے ساتھ چھ بجے مجھے پکچر جانا ہے۔

نورنگ : اوہو تو میں کوئی حامد کو منع تھوڑی کر رہی ہوں کہ وہ نہ جائیں پکچر دیکھنے.....

دونوں لڑکیاں بستر پر جا کر بیٹھ گئیں۔
شہناز نے تکیہ سرکا لیا۔
اور پلنگ پر ترچھی ہو کر لیٹ گئی۔

اور بولی :

شہناز : کہو..... کوئی کام ہے کیا ؟..... تمھارے چہرے پر فکر کے آثار نظر آرہے ہیں۔

نورنگ : (چھپاتے ہوئے)
نہیں فکر تو کچھ بھی نہیں ہے ..... بس وہاں کچھ دل نہیں لگتا ہے حالاں کہ امّی موجود ہیں۔

شہناز : کچھ ایسی یادیں بھی ہوا کرتی ہیں جو کسی جگہ سے وابستہ ہوتی ہیں نورنگ! ..... کیا تم نے یہ کبھی سوچا تھا کہ اس گھر کے ایک کمرے میں بیٹھ کر تم جو صنوبر سے عہد و پیمان کر رہی ہو وہ توڑنا پڑیں گے؟

نورنگ : ہاں یہی باتیں سوچتی ہوں تو عجیب سا لگتا ہے .... کتنی بڑی بات ہے کہ نکاح ہو گیا اور اب جب معلوم ہوا کہ ہم بڑے گھرانے سے وابستہ ہیں تو چھوڑ دو۔

شہناز : پھر کیا کیا جائے مجبوری ہے ..... امّی تو بڑی پریشان ہیں

نورنگ : اس وقت امّی جان نے جلدی میں نکاح کر دیا اور مجھے ملنے کی بھی اجازت دے دی۔

شہناز : لیکن یہ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ تم صرف ایک بار نکاح کے بعد ملی ہو .... میرا خیال ہے کہ تم بیشتر مل چکی تھیں اور تمھاری ہی تحریک پر پیغام آیا تھا۔

نورنگ : ہاں شہناز اب چھپانے سے کیا حاصل .... اس نے کئی بار مجھے روکا .... کئی بار مجھے ملا ..... جب میں بار بار روکنے سے عاجز آگئی اور مجھے خیال ہوا کہ امّی جان کو نہ معلوم ہو جائے تو میں نے اس سے کہا کہ تم بیگم ذکی سے بات کرو ..... میرا یہ بھی خیال تھا کہ میں زیر دستی کا بوجھ بنی ہوئی ہوں امّی جان پر تو جتنی جلدی اس گھر سے نکل جاؤں اچھا ہے مگر عزّت آبرو سے نکلوں .....

یہ نہ ہو کہ کوئی صنوبر سے بات کرتا دیکھ لے تو امی جان کو خبر ہو جائے اور وہ سوچیں کہ نہ معلوم کس خاندان کی لڑکی ہے کہ یہ حرکتیں کر رہی ہے۔

شہناز : ٹھیک ہے تم نے کوئی برا کام نہیں کیا.... ہر سمجھ دار لڑکی یہ ہی کرتی.... مگر تم نے ہم سے چھپایا..... اس کی ہم کو ضرور شکایت ہے.... نورنگ..... شہناز سے اچھی دوست تم کو نہ ملے گی۔

نورنگ نے آگے بڑھ کر شہناز کے گلے میں باہیں
ڈال دیں اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں
آنسو چھلک آئے۔

نورنگ : میں منالوں گی اپنی دوست کو۔

شہناز : ہم تم سے خفا کب ہیں.... دراصل تم اس گھر میں خود کو غیر سمجھتی رہیں.... اور سہمی سہمی سی رہتی تھیں اسی لیے تم نے مجھ سے نہیں کہا ہوگا۔

نورنگ : مگر اُس گھر میں رہ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہاں کا ہر شخص مجھ سے محبّت کرتا تھا اور اب وہ گھر غیر معلوم ہوتا ہے۔

شہناز : مگر اب سوچنا یہ ہے کہ کیا کیا جائے.... سعادت صاحب کی بیوی بہت تیز ہیں.... سنا ہے ان کا ایک بیٹا بھی ہے جو فوج میں کپتان ہے.... شاید..... وہ اس سے تم کو بیاہنا چاہیں۔

نورنگ : نہیں نہیں.... سنا ہے.... وہ بہت زیادہ امیر لڑکی سے

بیاہنا چاہتی ہیں ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ اسی لیے وہ خالدہ سے بیٹے کی نسبت کرنا چاہتی ہیں۔

شہناز : ممکن ہے سعادت صاحب خود تم سے کرنا چاہیں۔

نورنگ : نہیں شہناز ۔۔۔۔ اس گھر میں تو بیگم سعادت کا راج ہے۔

شہناز : اچھا یہ بتاؤ کہ کرنا کیا ہے ؟

نورنگ : میں چاہتی تھی یہ نکاح شہناز قائم رہے یا تو ذکی صاحب سعادت ماموں سے خود بات کر کے ان کو بتا دیں کہ کوئی برائی سے تو نکاح ہوا نہیں تھا اور سعادت صاحب سے کہیں کہ رخصتی روک دی جائے اور اس درمیان میں سعادت صاحب صنوبر کو کوئی اچھی سی نوکری دلوادیں - یہاں تو رسوخ پر نوکری ملتی ہے۔ قابلیت پر کچھ نہیں ہوتا - اگر سعادت ماموں چاہیں گے تو کسی کمپنی میں لگوا دیں گے - میں نے ان کے گھر رہ کر دیکھ لیا ہے کہ ان کا بڑے لوگوں میں کافی ملنا جلنا ہے۔

شہناز : اور اگر یہ نہ ہو تو ؟

نورنگ : پھر ذکی صاحب خود کسی اچھی جگہ صنوبر کو رکھوا دیں مگر نکاح توڑنے میں جلدی نہ کریں۔ ہائے شہناز دل چاہتا ہے کہ ایک بار تو میں مل لیتی صنوبر سے ۔۔۔۔ دیکھوں وہ خود کیا کہتا ہے -

شہناز : کچھ پتہ نشان معلوم ہوتا تو میں ہی اس کو خط لکھ کر بلا لیتی۔ مجھے خود رحم آتا ہے کہ وہ بے چارہ تو خوشی خوشی انتظام کر رہا ہے اور ۔۔۔۔ یہاں یہ مشکل آ پڑی ہے ۔۔۔۔ کہ اب شادی کے لالے پڑ گئے۔

نورنگ : اوہ شہناز یہ نہ کہو۔۔۔ تم ہی کچھ ترکیب نکالو گی۔

شہناز : دیکھو کسی وقت امّی سے بات کروں گی کہ وہ جلدی نہ کریں۔ تم وہاں بالکل خاموش رہنا اس واقعہ کا ذکر ہرگز نہ کرنا۔

نورنگ : اچھا ذرا ڈرائیور سے کہو مجھے گھر چھوڑ آئے۔

اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں غم و رنج کے سائے تیرنے لگے۔ شہناز نے باہر نکل کر ڈرائیور سے گاڑی لانے کو ملازم کے زبانی کہلا دیا۔

تھوڑی دیر میں گاڑی کمپاؤنڈ میں آگئی۔

اور نورنگ بیگم ذکی سے ملتی ہوئی ان سے اجازت لے کر چلی گئی۔

راحت کا ایم ایس سی کا نتیجہ نکل چکا تھا۔

وہ سیکنڈ ڈویژن پاس ہوا تھا۔

اب اس کو سکالرشپ کی فکر نہیں تھی بلکہ ملازمت کی تلاش تھی کیوں کہ وہ شرافت علی کی مصیبتوں کی وجہ سے جلدی سے جلدی شادی کر کے مہر کو لے آنا چاہتا تھا۔

نظیر کو وہ ساتھ لے آیا تھا اور اسے ماں کے سپرد کر چکا تھا۔ انھوں نے اسے ناظم آباد کے ایک اسکول میں چھٹی جماعت میں داخل کرا دیا تھا۔ لاہور میں بھی وہ چھٹی جماعت ہی میں پڑھتا تھا۔

راحت کی والدہ نے نظیر کے لیے اسکول کی یونی فارم کے علاوہ کئی جوڑے کپڑے تیار کرائے اور اس کے سونے اور پڑھنے کے لیے علیحدہ ایک چھوٹا کمرہ سادگی سے تیار کر دیا تھا۔

وہ عموماً شام کو خود لے کر اس کو بیٹھ جاتیں اور ہوم ورک کراتیں۔ ان کو اس شریف صورت بچّے پر بڑا رحم آتا تھا جو بری صحبت میں پڑتے پڑتے راحت کی توجہ کا مرکز بن کر ان کی نگرانی میں آ گیا تھا۔

اسکول کے وقت کے علاوہ وہ اس کو باہر نہ نکلنے دیتیں کہ وہ پھر کہیں بری صحبت میں نہ پڑ جائے۔

جہاں جاتیں ساتھ لے جاتیں۔

راحت ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔
ایک دفتر سے وہ میکلوڈ روڈ پر ناامید ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ چپراسی نے اسے روک لیا۔
اور بولا :
"میاں چپ چاپ جا رہے ہو کیا قصّہ ہے ؟"
راحت نے کہا :
"ارے بھئی چھوڑو بھی صبح سے کتنے دفتروں میں گیا ہوں مگر ہر جگہ صاف جواب ہے۔ مجھ سے تو تم ہی اچھے۔۔۔۔ فضول ہی ایم ایس سی کیا۔ میٹرک ہی رہتا تو چپراسی کی جگہ تو مل ہی جاتی"۔
چپراسی بولا :
"عجب آدمی ہیں آپ بھی۔ اپنے ملک میں نوکری کوئی تعلیم پر تھوڑی ملتی ہے۔۔۔۔۔ کسی بڑے آدمی کی سفارش لاؤ۔۔۔۔۔ تب نوکری ملتی ہے بھیّا !"
راحت نے کہا :
"کوئی بڑا آدمی میری سفارش کیوں کرنے لگا۔۔۔۔ وہ کوئی میرا چچا تھوڑی لگتا ہے"۔
چپراسی کہنے لگا :
"ہاں تو پھر آئے کیوں۔۔۔۔۔ یہ جو ہمارے ایک افسر کا سامنے بورڈ لگا ہے۔۔۔۔ اعجاز احمد۔۔۔۔۔ یہ صرف سینئر کیمبرج پاس ہیں مگر ایک سیکرٹری کے بھائی ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے یہ کمپنی ان کو دو ہزار روپیہ تنخواہ دیتی ہے"۔

راحت نے سامنے دیکھا۔

بورڈ پر نظر ڈالی۔

اور چپراسی سے "شکریہ" کہتا ہوا نکل آیا۔

دوسرے روز سے وہ کپڑے کی ملوں میں ملازمت تلاش کرنے لگا۔ کئی روز منگھوپیر روڈ اور لانڈھی کے چکر لگانے کے بعد اُس نے اندازہ لگایا کہ ہر جگہ اس کی ایم ایس سی کی ڈگری ملازمت کے درمیان حائل ہے۔

اور اب اس نے باقی ملوں میں جانے کے لیے ایک پرانی پتلون اور ایک معمولی سا بش شرٹ پہن لیا۔ ڈگری کو بکس میں بند کر کے وہ خالی ہاتھ گھر سے نکلا اس کو یاد آیا کہ ایک مل مالک کا بھتیجا اس کا کسی زمانے میں کلاس فیلو تھا۔ وہ تلاش کر کے اس کے پاس پہنچا اور اس سے ایک سفارشی خط لکھوالیا جس میں اس نے لکھ دیا کہ:

"راحت کو مل مزدور کی حیثیت سے داخل کر لیا جائے!"

راحت نے یہ چیز کہ اس نے ایم ایس سی کر لیا ہے اس لڑکے کو بھی نہیں بتائی اور اس کا خط لے کر لانڈھی میں مل پر پہنچا۔ اسی روز اس کو مزدور کی حیثیت سے مل میں بھرتی کر لیا گیا۔

چار روپیہ روزانہ پر اس نے کام شروع کر دیا۔ اور کینٹین سے دوپہر کو سستا کھانا بھی کھانے لگا۔

اس نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا کہ وہ مزدور ہے۔ اس نے سوچا کہ ان کو رنج ہوگا۔۔۔۔۔۔ اور وہ یہی سمجھنے لگیں کہ ان کا ایم ایس سی پاس بیٹا کسی مل کے دفتر میں ملازم ہے۔

اس نے ماں سے کہہ دیا کہ تنخواہ ابھی کم ہے چھ ماہ بعد مستقل ہونے پر ترقی ہو جائے گی۔

کینٹین میں کھانا کھانے کی وجہ سے مزدوروں سے اس کے تعلقات دن بدن بڑھتے گئے۔ وہ ان سے ان کے حالات معلوم کرتا اور ان کی مشکلات سنتا۔

ایک چھوٹی سی میز پر چار مزدور کھانا کھا رہے تھے راحت بھی ان ہی میں تھا کالے خاں جو پرانا مزدور تھا۔

راحت سے بولا :

"راحت بھیّا ! تُو تو کسی شریف کا بچّہ معلوم ہوتا ہے۔"

راحت نے جواب دیا :

"نہیں بھائی جیسے تم ویسے ہیں۔ تم کیا شریف نہیں ہو ؟"

گلریز نے کہا :

"خو تم اَم سے چھپاتا ہے۔ تاجر ہے تاجر..... ہم کو مالوم ہوتا ہے..... کچھ افتاد پڑا ہے اس غریب پر۔"

راحت بولا :

"میں نے کچھ نہیں چھپایا بھائی تم سے۔"

کالے خان کہنے لگا :

"کسی کو حال نہیں بتاتا۔ پڑھا لکھا لگتا ہے..... بس اپنا کام کیے جاتا ہے۔"

راحت نے جواب دیا :

"بس نویں کلاس سے چھوڑ دیا..... پھر رئیسوں میں گھریلو نوکریاں کرتا پھرا..... اب خدا خدا کر کے مل میں جگہ ملی ہے

بھیّا اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

مدّو نے کہا :

"پھر بھی تم ہم سب سے زیادہ تمیزدار ہو۔"

راحت مدّو کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولا :

"چل یار کھانا کھا دیر ہو رہی ہے کام پر جانا ہے۔"

راحت کو ان مزدوروں سے دلچسپی تھی۔ اور وہ دن بدن ان کے ساتھ گھلتا ملتا جاتا تھا۔

اس نے یہ خیال چھوڑ دیا تھا کہ اچھی ملازمت ملنے پر وہ یہ جگہ چھوڑ دے گا اس نے سوچا وہ مہر کو سب کچھ بتا دے گا۔ مہر کی اور امّی کی گزر کے لیے کوٹھی کا کرایہ کافی ہے۔ اور میرے لیے یہ چار روپیہ روزانہ بہت کافی ہیں۔

یوں بیکار پھرتا رہوں اور دفتروں میں لوگوں کی خوشامدیں کروں پھر بھی جگہ نہ ملے اس سے بہتر ہے مزدوری کروں۔ پھر یہ بے چارے غریب مزدور کتنی محبّت کرتے ہیں۔ کتنی عزّت کرتے ہیں۔ کیا برائی ہے اس پیشے میں اور کیا خرابی ہے ان مزدوروں کے ساتھ کام کرنے میں۔

راحت کو چار پانچ ماہ ملازمت کرتے ہو چکے تھے۔ شرافت علی سے اس کی خط و کتابت جاری تھی۔

منور جو لاہور سے قریب ہی تھا جا کر کبھی کبھی ان سے مل بھی لیتا اور کچھ مدد بھی کر دیتا تھا۔ راحت کو وہ برابر خطوں میں لکھ رہا تھا۔

قمر کا نکاح ہو چکا تھا اور وہ رخصت ہو کر سسرال جا چکی تھی۔

عید کا چاند قریب تھا۔

راحت کی والدہ نے شرافت علی کو خط لکھا اور مہر کی رخصتی کے لیے عید کے چاند کی اکیس تاریخ مقرر کر لی۔ اور ان کی منظوری کا خط راحت کو دکھا کر کہا:

"تم مل سے پندرہ دن کی رخصت لے لو تا کہ رخصتی کرا کر لڑکی کو لے آئیں۔ اب مجھ سے اکیلے گھر میں نہیں رہا جاتا۔"

انھوں نے راحت کے کمرے کے پردے وغیرہ بدلوا کر اور نئی دو عدد مسہریاں ڈال دیں۔ نئے بستر اور نئی پٹا پٹی کی گوٹ کی ریشمی رضائیاں تیار کرا کر مسہریوں پر لگا دیں۔

خوب صورت سی ڈریسنگ ٹیبل ایک طرف لگا کر خود ہی میک اپ کا سارا سامان سجا دیا۔

ایک گلابی رنگ کی سٹیل کی الماری دلہن کے کپڑوں کے لیے بھی لا کر کونے میں کھڑی کر دی۔

راحت کے لیے سفید شیروانی سے جوڑا تیار کرا لیا اور بنارسی صافہ منگا لیا وہ سہرا باندھ کر بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔

مہر کے لیے انھوں نے گیارہ جوڑے خوب صورت تیار کرا لیے اور اپنا پورا جڑاؤ زیور صاف کرا کر نئے تاگے ڈلوا کر رکھ لیا۔

بری کا جوڑا گہرا سرخ بنایا۔ گو کھرو کا کام کروا کر جوڑا کافی بھاری اور بےحد خوب صورت تیار کیا۔

ایک سوٹ کیس میں دلہن کا کل سامان رکھ لیا۔

نظیر کے لیے دو تین گیبے ڈین کی پتلونیں اور ڈیکورین کے قمیص تیار کرائے۔

انیس تاریخ کو ماں، راحت اور نظیر کو لے کر تیز گام سے لاہور روانہ ہو گیئں۔ لاہور میں وہ سمن آباد میں اپنی ایک رشتے کی خالہ زاد بہن کے گھر ٹھیر گیئں۔ منور کو شادی کی تاریخ کی اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی۔

اکیس تاریخ کو راحت، اس کی والدہ، نظیر، راحت کی خالہ اور خالو..... شرافت علی صاحب کے گھر گئے۔

منور نے چائے کا انتظام اپنی طرف سے کیا تھا اور مہر کے لیے چار ساڑھیاں اور چار بلاؤز بھی تیار کرا کر لاہور ہی سے ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں بطور جہیز رکھ دیئے تھے۔

مہر کو سسرال کا پورا زیور اور بری کا جوڑا پہنا کر قمر نے دلہن بنا دیا اور ایک جوڑا اپنی طرف سے اسی سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

چائے کے بعد رخصتی کی رسم ادا ہوئی۔

اور راحت سہرا باندھے اندر بلایا گیا۔

شرافت علی صاحب نے اپنے داماد اور ان کے ماں باپ کے علاوہ چار پانچ محلے والوں کو بھی بلایا ہوا تھا۔

آرسی مصحف کے بعد رخصتی کی رسم ادا ہوئی اور طے پایا کہ شرافت علی اور ان کا خاندان دوسرے روز سمن آباد میں راحت کی والدہ کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت پر آئیں۔

منور اسی وقت اپنی ڈیوٹی پر واپس چلا گیا۔ اور دوسرے روز کھانے پر آنے کا وعدہ کر گیا۔

دوسرے روز شام کو نہلا دھلا کر ساس نے مہر کو اپنے لائے ہوئے جوڑوں میں سے فیروزی بنارسی ساڑھی پہنائی۔ اتنے میں منور کے آنے کی

اطلاع ملی۔

راحت باہر جاکر اس کو اندر لے آیا۔ اور اپنے کمرے میں جو خالہ نے اس کے لیے درست کر دیا تھا لے گیا۔

منوّر : اوہو ! دولہا میاں اب تو کمرے ہی میں بند ملیں گے ۔

راحت : ہاں کیوں نہیں جلتے رہو میاں تم سوچتے ہی رہے اور یہاں چاند سی دلہن بیاہ بھی لائے ۔

منوّر : زیادہ شیخی مت بگھارو یہ سب کیا ہوا تو میرا ہی ہے ۔

(مہر سے) :

کیوں بھابی ؟ یہ بہروپیا پسند بھی آیا کہ نہیں ..... مل میں مزدوری کرتا ہے ۔

مہر : (نیچی نظروں سے)

سب کچھ یہ مجھے بتا چکے ہیں بھیّا !

منوّر : اوہو تو پہلی رات ہی کو کہانی سنادی۔

راحت : اور کیا تمھاری طرح کہ وہ بے چاری یہ ہی سمجھ رہی ہے ، کہ صنوبر کوئی غریب ملازم ہے۔

مہر : (ایک دم گھبرا کر دیکھا اور آہستہ سے بولی)

یہ کیا گل صنوبر کا قصہ آپ لے بیٹھے۔

راحت : ہاں ہاں مہر ! یہ کم بخت صنوبر بن کر ایک معصوم لڑکی کو دھوکا دے رہا ہے ...... واقعی وہ لڑکی تو بالکل بھول ہے.... مطلب یہ کہ "گؤ"۔

مہر : کیا یہ سچ ہے منور بھیّا !

منوّر : ہے تو حقیقت .... مگر دھوکے کا لفظ اس شخص کی ایجاد ہے۔
میں کوئی دھوکا نہیں دے رہا ہوں۔ اسی سے آپ پورا قصہ سن لیں اور ہو سکے تو کراچی جا کر اس لڑکی سے مل بھی لیں۔ یقیناً آپ اسے پسند کریں گی۔

مہمان آ چکے تھے۔

یہ تینوں باہر نکل آئے۔

تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔

شرافت علی کی بیوی اگرچہ بیمار تھیں مگر آئی تھیں اور صوفے پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اور بیٹی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

سب نے میز پر کھانا کھایا۔

مہر کی والدہ کے لیے صوفے کے قریب چھوٹی میز لگا دی گئی۔

کھانے کے بعد سب لوگ رخصت ہو گئے۔

دوسرے روز تیز گام ہی سے راحت، ان کی والدہ، نظیر اور مہر کراچی روانہ ہو گئے۔

نورنگ کو سعادت صاحب کے گھر آئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔
شبنم کے چلے جانے کی وجہ سے وہ اب گھر میں اکیلی لڑکی تھی۔
سعادت صاحب اس سے بہت خوش تھے۔
روزانہ شام کو دو گھنٹے وہ استانی سے انگریزی سیکھ رہی تھی۔ خدیجہ بیگم اس کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں مگر ان کو اب بھی اپنے بچّے کی یاد ستاتی تھی اور راتوں کو وہ نماز میں دعائیں مانگتی تھیں کہ :

"اے اللہ تو میرا بچّہ بھی مجھ سے ملا دے۔"

بیگم سعادت اس چیز سے تو خوش تھیں کہ نورنگ نے ان کے گھر کا کل کام سنبھال لیا تھا۔ خدیجہ بیگم باورچی خانے کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ مگر ایک چیز ان کو بہت کھلتی تھی کہ دیہات میں تربیت ہونے کی وجہ سے نورنگ میں وہ تیزی و طراری نہیں تھی جو شہر کی لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔ خصوصاً کراچی کے اپر کلاس کی لڑکیوں میں ...... پھر وہ کسی کالج یا اسکول کی پڑھی ہوئی بھی نہ تھی۔ نورنگ کے مقابلے میں خالدہ انھیں ہزار درجہ زیادہ پسند تھی کہ وہ جب کبھی آجاتی گھر میں ترنّم ریز قہقہے گونجنے لگتے۔

وہ اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ منوّر کی آمد سے قبل وہ نورنگ کی شادی کسی جگہ کرا دیں تاکہ ان کا بیٹا اس کے مسحور کُن حسن سے متاثر نہ ہو سکے۔
اس سلسلے میں انھوں نے جا بجا گفت گو شروع بھی کر دی تھی مگر اس وجہ سے

کہیں کامیابی نہیں ہو سکی کہ وہ کسی اسکول کی تعلیم یافتہ نہیں تھی۔

مجبور ہو کر بیگم سعادت اپنے ہی خاندان کے ایک لڑکے سے شادی کر دینے پر زور دے رہی تھیں جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا اور جس نے بمشکل تین سال تک فیل ہو کر میٹرک کیا تھا۔

اس لڑکے کو سعادت صاحب نے ہی سفارش کر کے کلرک کی جگہ تقرر کرا دیا تھا۔ وہ بھی کسی پرائیویٹ فرم میں جہاں آئندہ ترقی کی کوئی امید نہیں تھی بیگم سعادت نے جب ان سے کہا کہ وہ اس لڑکے سے نورنگ کی شادی کرنا چاہتی ہیں تو سعادت صاحب کو منظور نہ ہوا کیوں کہ ان کو اپنی بہن سے بہت ہمدردی تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نورنگ جیسی بھولی سی لڑکی کو کس طرح ایسے بیکار لڑکے سے بیاہ دیا جائے۔

بیگم کو بے حد اصرار تھا۔

اور دونوں میں نوک جھونک چل رہی تھی۔

بیگم سعادت : تو آخر نصیر میں کیا برائی ہے۔۔۔۔ وہ ہے تو تمھارے ہی خاندان کا لڑکا۔ صورت شکل کا بھی اچھا ہے۔ ملازم بھی ہے۔

سعادت صاحب: بیگم یہ بھی تو سوچو کہ خدیجہ نے کس مشکل سے لڑکی کو پالا ہے پھر اس پر یہ جنگ کی مصیبت آ گئی۔ اب کچھ تو بے چاری کی اشک شوئی ہو جائے۔ شاید داماد اچھا مل جائے تو وہ اپنے گم شدہ بیٹے کو بھول جائے۔

بیگم سعادت : اونھ۔۔۔۔ بغیر پڑھی لکھی جاہل لڑکی کو کون سا پڑھا لکھا لڑکا کر کے لے جائے گا۔ نہ اس کو سوسائٹی میں ملنا جلنا آئے

نہ بات ہی کرنا آئے ...... شرم کی پڑیا ...... آج کل شادیاں اس طرح نہیں ہوتیں۔ لڑکیاں خود لڑکوں سے ملتی جلتی ہیں تب کوئی اچھا لڑکا پھنستا ہے ...... اور ...... یہ تو دو منٹ بھی کسی لڑکے سے بات نہیں کر سکتی ...... عجب گوڑھ مغز لڑکی ہے .... توبہ توبہ۔

سعادت صاحب: بیگم یہ تو اس کی شرافت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آجکل کے زمانے میں ایسی لڑکی کو گوڑھ مغز تصوّر کیا جاتا ہے۔ مجھے تو نورنگ کی شرم و حیا بہت پسند ہے۔ یہاں شہر میں اس کی طرح کی لڑکی ملنا مشکل ہے۔

بیگم سعادت: تو پھر کیا ارادہ ہے کہیں یہ تو سوچے نہیں بیٹھے ہیں آپ کہ منوّر کے سر تھوپ دیں اپنی بھانجی کو۔

سعادت صاحب: لاحول ولا قوۃ ...... میں کیوں تھوپنے لگا ..... وہ تو آپ خود ہی کہہ رہی ہیں کہ لڑکیاں خود مل کر لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں ...... تو کوئی ایسی ہی لڑکی آپ کی بہو بن کر خود ہی آجائے گی۔

بیگم سعادت: ہاں ہاں ضرور آجائے گی فی الحال تو خالدہ سے زیادہ اچھی لڑکی نہیں مل سکتی اور وہ لوگ بھی تیار ہی ہیں کیونکہ کئی پیغام ہیں اس کے مگر سب اس ہی لیے روکے ہوئے ہیں کہ منوّر ہاں کرلے ...... اس بار منوّر آجائے .... تو نکاح ضرور ہو جانا چاہیے۔

سعادت صاحب: جو آپ کا دل ہو بیگم آپ کریں۔ آپ کا بیٹا جانے اور آپ

جانیں.... مگر مہربانی سے نورنگ کی شادی میں جلدی نہ کریں میں نے اس کے لیے ٹیچر کا انتظام اس لیے کیا ہے کہ میں اس کو میٹرک کے امتحان میں شامل کرانا چاہتا ہوں تاکہ یہ چیز ختم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھی ہوئی وہ نہیں ہے۔

بیگم سعادت : اے بس بس رہنے بھی دیجیے بوڑھے طوطے بھی کہیں پڑھا کرتے ہیں۔ پھر میٹرک کر بھی لیا تو کیا ہو جائے گا۔ آجکل تو لڑکیاں ایم اے سے کم پہ نہیں مانتیں۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تعلیم میں کامیاب ہیں۔

اور یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ کر چل دیں۔

خدیجہ بیگم کے کمرے میں جا کر انھوں نے ان سے بھی تھوڑی ہمدردی جتا کر کہنا شروع کیا۔

"اے آپا خدیجہ ایک لڑکا ہے نورنگ کی شادی کرو گی؟"

خدیجہ بیگم بولیں :

"کیا کرنا ہے ؟ ..... سعادت بھائی سے ذکر کیا ہوتا.... میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں ہوں۔"

بیگم سعادت نے کہا :

"اے مرد کیا جانیں یہ کام تو عورتیں کرتی ہیں۔ دیکھا بھالا لڑکا ہے..... وہ نہ نصیر سعادت صاحب کے رشتہ دار بھی ہیں اس کے والدین...... اکثر آتا ہے..... اس کی ماں کہہ رہی تھیں کہ اب نوکری تو آپ نے دلوادی ہے.... شادی بھی کرا دو......"

خدیجہ بیگم نے پوچھا :

"تنخواہ کیا ملتی ہے اس کو ؟"

بیگم سعادت نے جواب دیا :

"یہی کوئی سوا سو روپیہ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر گھر تو ان کا اپنا ہی ہے لانڈھی میں کوارٹر ملا ہوا ہے۔"

خدیجہ بیگم بولیں :

"مگر بھابی سوا سو روپوں میں لڑکی کیا کرے گی۔ لاکھ ہم گاؤں کے رہنے والے ہیں مگر میں نے بچوں کو بڑے آرام سے رکھا ہے۔"

بیگم سعادت نے کہا :

"ہاں تبھی تو آپ نے لاڈو کو کسی اسکول میں داخل نہیں کیا یہاں شہر میں تو لڑکی کی تعلیم پوچھی جاتی ہے بُوا ۔ ۔ ۔ ۔"

خدیجہ بیگم کہنے لگیں :

"وہاں اسکول ہی نہ تھا۔ بچہ اسکول میں پڑھتا تھا تو دو میل دوسرے گاؤں میں جانا پڑتا تھا۔"

ان کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ۔ ۔ ۔ ۔ دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولیں :

"شادی تو ہونی ہی ہے مگر کم سے کم روٹی کپڑا تو مل جائے۔"

بیگم سعادت نے کہا :

"بھئی میں نے تو اپنے خیال میں اچھی جگہ ہی بتائی ہے آگے تم جانو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خدیجہ بیگم بولیں :

"اب تو بھائی صاحب نے پڑھانے کا انتظام بھی کر دیا ہے کچھ سیکھ ہی لے گی۔"

بیگم سعادت نے کہا :

"اے نواب کوئی پڑھنے کی عمر ہے۔ جوان لڑکی ہے۔ جوانی دیوانی ہوا کرتی ہے ..... کسی جگہ عزّت سے ہو جائے تو بہتر ہی ہے۔"

خدیجہ بیگم کو ان کا یہ فقرہ بُرا لگا مگر کیا کرتیں ان کے ٹکڑوں پر پڑی تھیں خاموش ہو کر رہ گئیں۔ مگر اس روز سے ان کو فکر لگ گئی اور وہ سمجھ گئیں کہ بھاوج نورنگ سے اپنی جان چھڑانا چاہتی ہیں۔ وہ اکثر سوچتیں کہ بیگم ذکی کے پاس ہی اس کو رہنے دیتیں۔ وہ لوگ محبت بھی کر رہے تھے اور چین سے بچّی رہ بھی رہی تھی مگر اب اگر دوبارہ بھیجا جائے تو نہ معلوم وہ لوگ کیا سوچیں گے اور پھر سعادت صاحب بھی اجازت نہ دیں گے۔

نورنگ ہر طرح بیگم سعادت کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی اور ان کا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی مگر بیگم سعادت کو یہ خوف کھائے لے رہا تھا کہ منور نورنگ سے نہ مل لے کہیں اور اس کی آمد سے پہلے کسی طرح اس کو وہ رخصت کر دیں اس لیے انھوں نے اپنی کئی ملنے والیوں سے بھی تذکرہ کر دیا تھا کہ کوئی لڑکا ہو تو نورنگ کے لیے بتائیں۔

راحت کی جب سے شادی ہو گئی تھی۔

وہ آیا ہی نہ تھا۔

نہ اسے یہ معلوم ہو سکا کہ نورنگ سعادت صاحب کے گھر آ گئی ہے اور

اگر وہ آتا بھی تو پتہ نہ چلتا کیوں کہ بیگم سعادت سے اگر کوئی ملنے آتا تھا، تو نورنگ احتیاطاً اپنے کمرے ہی میں رہتی تھی۔

وہ ان کی عادتوں کو سمجھ گئی تھی۔

اور جانتی تھی کہ !

بیگم ذکی کی طرح بیگم سعادت اس سے محبت نہیں کرتیں بلکہ اس سے کچھ کھنچی کھنچی رہتی ہیں۔

✣

آج منوّر ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آ رہا تھا۔
مگر اس نے گھر پر کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔
وہ اچانک پہنچ کر سب کو حیران کرنا چاہتا تھا۔

صبح صبح سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے اور گھر کے مختلف کاموں سے فارغ ہو کر بیگم سعادت برآمدے میں آ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے قریب ہی ٹوکری میں کچھ اون کے گولے پڑے ہوئے تھے اور وہ آسمانی اور نیوی بلو اون سے سعادت صاحب کا سویٹر بنا رہی تھیں۔

نورنگ بھی گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر کرسی پر ان کے برابر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اپنی انگریزی کی کتاب کے سبق کو دل ہی دل میں یاد کر رہی تھی۔

خدیجہ بیگم باورچی خانے میں خانساماں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

سامنے کوٹھی کے لان میں موسم سرما کے رنگ برنگے پھول لہلہا رہے تھے اور مالی قینچی لیے درختوں کو تراش رہا تھا۔

سبز گھاس کے گرد گلابی نیلے زرد اور سنہری پھول بے حد حسین نظر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی نظر اٹھا کر بیگم سعادت مالی کی قطع و برید پر نظر ڈال لیتیں، اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دے کر اس کو تازہ ہدایات دیتی جاتیں۔

اچانک ہی کوٹھی کے آہنی دروازے پر ایک کالی اور پیلی ٹیکسی آ کر رکی۔
بیگم سعادت کے ساتھ ہی نورنگ کی نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں۔

ٹیکسی کا دروازہ کھلا۔

منور ایک دم اترا۔

اس نے ملازم کو پکارا کہ وہ سامان اتار لے۔

اور اپنا تھیلا لیے ہوئے دوڑ کر ماں کے پاس پہنچا۔ اور ایک دم ان کے گلے سے لپٹ گیا۔

"امی میں آ گیا۔"

اس کے منہ سے نکلا۔

یہ سب اتنا یک بارگی ہوا کہ نورنگ بوکھلا گئی۔

منور کو اترتے دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ نورنگ کا پتہ لگا کر آ پہنچا ہے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے جب اس نے بیگم سعادت کے گلے میں باہیں ڈالیں تو وہ حیران رہ گئی۔

پھر..........

"امی میں آ گیا"۔

کے الفاظ نے اس کو سب کچھ سمجھا دیا۔

ماں نے گھبرا کر پوچھا :

"خود ہی آ گئے اطلاع بھی نہ دی۔"

ماں سے نظر ہٹا کر اس نے دوسری طرف دیکھا تو نورنگ کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔

وہ ایک حیرانی کے عالم میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

نورنگ کی نظریں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔

بیگم سعادت بولیں :

"اے منور ! یہ خدیجہ بیگم کی بیٹی نورنگ ہے۔ بے چاری گاؤں میں رہی ہے نا بہت شرمائی ہے .... اے وہ کیا جانے شہر کی زندگی ...."

منوّر خوش ہو کر بولا :

"ہلو ! آپ پھوپھی کی بیٹی کیسے بن گئیں ؟"

نورنگ کو چھیڑتے ہوئے اس نے کہا۔

نورنگ نے اٹھ کر سلام علیکم تو کر لیا مگر اس کو غصہ آ رہا تھا۔ کہ :

"منور نے صنوبر بن کر اتنے عرصے تک اس کو دھوکا دیا ہے۔"

اب اس کو پتہ چلا کہ یہ سعادت صاحب کے بیٹے منوّر ہیں جن کا ذکر وہ روز سنتی تھی۔

اس نے لاپرواہی سے نظریں دوسری طرف کر لیں اور اپنی کتاب لے کر جانے لگی۔

منور جلدی سے بولا :

"ارے ارے آپ کدھر بھاگی جا رہی ہیں .... ابھی تو صرف تعارف ہی ہوا ہے بات بھی تو کرنا ہے۔"

بیگم سعادت کہنے لگیں :

"نہیں نہیں اس کو جانے دو۔ کہا نا کہ وہ گاؤں کی پلی ہوئی ہے وہ کیا جانے تم شہری لوگوں کے مذاق۔"

منور نے نورنگ کو چھیڑتے ہوئے کہا :

"جائیے جائیے ہم گنواروں سے بات نہیں کرتے۔ اور ہاں

امّی خالدہ کیسی ہیں ؟"

نورنگ نے بیگم سعادت کا جواب نہیں سنا اور وہ جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

منوّر کو گھر آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔

اس کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ شبنم کی شادی میں بیگم ذکی دولہا والوں کی طرف سے آئیں تو نورنگ ان کے ہمراہ تھی اور آرسی مصحف کے وقت خدیجہ بیگم نے اس کو پہچان لیا تھا۔

تب سے نورنگ اسی گھر میں رہتی ہے۔

اس نے یہ بھی دیکھا۔

کہ ایک ٹیچر اس کو انگریزی پڑھانے بھی آتی ہے۔

مگر نورنگ نے اس عرصے میں اس سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

وہ اگر اس کے سامنے بھی آتی تو بیگم سعادت کی موجودگی میں کھانے یا ناشتے کی میز پر ورنہ زیادہ تر وہ اپنے کمرے ہی میں رہتی۔

منور دل میں بہت خوش تھا۔

کہ نورنگ اس کی پھوپھی کی بیٹی نکلی۔

اور اب شادی میں آسانی رہے گی۔

اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ نورنگ کے اس کے ساتھ نکاح کا اس گھر میں کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اور وہ بیگم ذکی کی اس عقلمندی سے بہت ہی خوش تھا کہ انھوں نے یہ راز یہاں کے لوگوں کو نہیں بتایا ہے۔ مگر نورنگ

کی اس قدر بے تعلّقی پر پہلے تو اس کو افسوس ہوا۔
پھر اس نے سوچا:
کہ نکاح تو ہو ہی چکا ہے کوئی اب نکاح کو تو فسق کرا ہی نہیں سکتا، تو کیوں نہ نورنگ سے چھیڑ چھاڑ اور مذاق کیا جائے۔
اس ہی لیے اس نے آتے ہی خالدہ کو پوچھا۔
اور پھر دوسرے روز ہی جب خالدہ اس سے ملنے آ پہنچی تو منور نے خالدہ کے ساتھ پروگرام بنانا شروع کر دیئے۔
روزانہ وہ آ جاتی۔
اور روزانہ کوئی نہ کوئی پروگرام بن جاتا۔
بیگم سعادت دل ہی دل میں بے حد خوش تھیں۔ ان کو نورنگ کی یہ بات بہت پسند آئی کہ وہ ان کے بیٹے سے الگ الگ رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ انھوں نے اس کو تعریف کی نظر سے دیکھا کہ گاؤں کی پرورش میں ایک بات ضرور ہے کہ لڑکیاں خود بخود لڑکوں کے سر نہیں ہوتیں۔
منور سے بھی اب کی بار وہ بہت خوش تھیں کیوں کہ وہ اس مرتبہ خالدہ میں بہت زیادہ دل چسپی لے رہا تھا۔
ان کو کیا معلوم کہ یہ سب ڈھونگ وہ محض نورنگ کو چڑانے کے لیے کر رہا ہے۔
انھوں نے اپنے آپ ہی یہ طے کر لیا۔
کہ اب کے منگنی تو ضرور کر دیں گی۔
اور آئندہ چھٹیوں میں شادی۔
خالدہ بھی پھولی نہیں سما رہی تھی کہ آخر منور کو پھانس ہی لیا اور وہ روزانہ

رنگ برنگے بال بنا کر پوری طرح میک اپ کر کے آجاتی تاکہ آج کے پروگرام پر عمل کریں۔

ہر پروگرام کا گھر میں کافی شور کیا جاتا۔

اور واپسی پر قہقہے لگا لگا کر ڈرائنگ روم میں امّی کو قصّے سنائے جاتے کہ آج ہم نے یہ مزے کیے۔ منور کی کوشش یہ ہوتی کہ کسی طرح یہ باتیں نورنگ کے کانوں تک پہنچ جائیں۔

اس نے مذاق میں اس کا نام گاؤں کی بیگم رکھا ہوا تھا۔

اکثر وہ آواز لگاتا :

"ارے کدھر ہیں وہ گاؤں کی بیگم..... ذرا خالدہ کے لیے اور میرے لیے کوئی جوس وغیرہ تو بھیج دیں۔"

نورنگ اس کی باتوں پر جز بز ہو کر رہ جاتی۔

کبھی تو وہ سوچتی کہ :

"امیروں کے بیٹے ایسے ہوتے ہیں کہ ادھر مجھے پھنسایا اور امّی جان (بیگم ذکی) کو فریب دے کر نکاح بھی کر لیا ادھر خالدہ سے پینگ بڑھ رہی ہے۔"

اکثر اپنی محبت کو سوچتی جو منور جیسے ہرجائی کو صنوبر جان کر اسے ہو چکی تھی۔

اور کبھی وہ اس کو خالدہ کی جانب متوجہ دیکھ کر عجب بیزاری سی محسوس کرتی۔

اکثر وہ یہ بھی سوچتی کہ :

"شہناز سے جا کر سب کچھ کہہ دے"

مگر پھر سوچتی کہ ابھی تو کچھ نہیں بگڑا ہے۔ حالات تھوڑے دنوں دیکھے

جائیں کہ کدھر جا رہے ہیں۔

مگر تب بھی اب غریب صنوبر امیر منور کے روپ میں ڈھل چکا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

وہ سوچتی کہ :

"محبت تو اس کو صنوبر سے تھی..... منور تو اس کے لیے
بالکل نیا آدمی ہوا۔"

مگر یہ سب سوچتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں خالدہ اور منور کو ساتھ ساتھ جاتے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا۔ وہ ایک کرب اور ایک جلن سی محسوس کرتی۔ اپنی ناکامی اور اپنی فضول محبت کا خیال اندر ہی اندر اس کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ دن بدن رنج و غم سے وہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔ مایوسیوں کے سائے اس کی نرگسی آنکھوں میں صاف نظر آ رہے تھے اور اب وہ منور کی حرکتوں سے بیزار ہو چکی تھی۔

خالدہ روزانہ شام کو نت نئے نیم برہنہ لباسوں میں ہنستی قہقہے لگاتی آ جاتی اور منور نورنگ کے وجود کو بالکل فراموش کیے ہوئے اس کو لے کر نکل جاتا۔ معلوم ہوتا کہ جیسے منور کبھی نورنگ کو جانتا ہی نہ تھا۔

اکثر خالدہ اور منور بارہ بجے رات کو لوٹتے۔

پھر گھر میں کافی کا دور چلتا۔

اور اس کے بعد !

وہ اس کو چھوڑنے چلا جاتا۔

کبھی کبھی چلتے ہوئے اگر نورنگ سامنے آ جاتی تو منور اس پر کوئی مزاحیہ فقرہ چست کرتا ہوا نکل جاتا..... یا پھر اپنے کسی کام کا آرڈر دیتا ہوا چل دیتا۔

منور نے اتنے عرصے میں کبھی بھی نورنگ سے صفائی کی کوشش نہیں کی تھی۔

راحت کو اس نے جب ملا تو بتا دیا تھا کہ :

" نورنگ میری پھوپھی زاد بہن یعنی خدیجہ بیگم کی بیٹی نکلی اور وہ آجکل ہمارے ہی گھر میں رہ رہی ہے مگر وہ یہ سمجھ کر کہ میں نے اس کو صنوبر بن کر دھوکا دیا ہے اس لیے کافی ناخوش ہے اسی عرصے میں اس نے مجھ سے صفائی کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ میں نے اس کے غصے کا اور تماشا دیکھنے کے لیے خالدہ کو لفٹ دینا شروع کر دی ہے۔ اب وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ میں خالدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ امی جان نے پہلے ہی مشہور کیا ہوا تھا کہ خالدہ سے منگنی ہوگی۔ غرض آجکل ہم پر بڑا عتاب ہے ۔"

راحت نے کہا :

" یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے منور تم دو لڑکیوں کے جذبات سے بلاوجہ کھیل رہے ہو۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم فوراً صفائی کر لیتے اور سب کو بتا دیتے کہ نورنگ تمھاری منکوحہ بیوی ہے ۔"

منور بولا :

" تم کو پتہ نہیں راحت کتنا مزا آ رہا ہے نورنگ کو جلانے میں اس کا غصہ آج کل دیکھنے کے لائق ہے جب بھی مجھ پر نظر پڑتی ہے بھنا کر نکل جاتی ہے ۔

راحت کہنے لگا :

" لاحول ولا قوۃ .... کیا فضولیات لگا رکھی ہے تم نے ۔ میری تو

سمجھ میں نہیں آتا تمھارا یہ کرتب :

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

منوّر نے کہا :

" ہاں اور کیا مگر امّی تو آج بھی خالدہ کے ہی حق میں ہیں ان کو نورنگ میں کوئی دل چسپی نظر نہیں آرہی ہے وہ مفلس جو ہے اور خالدہ دولت لے کر جو آرہی ہے۔ وہ خالدہ کے اور میرے میل جول سے بہت خوش ہیں۔"

راحت بولا :

" تو کیا اب بھی وہ مخالفت کریں گی۔"

منور کہنے لگا :

" ضرور ان سے آج بھی مخالفت کی پوری پوری امید ہے وہ تو نورنگ کی جلد سے جلد شادی کرانے کی فکر میں ہیں۔"

راحت نے کہا :

" خوب خالہ جان بھی عجیب ہیں۔"

✣

نورنگ۔ اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹی ہے۔
اس کے بال تکیے پر بکھرے ہوئے ہیں۔
اس کی آنکھیں کچھ سوجی سوجی سی ہیں۔
معلوم ہوتا ہے وہ رو چکی ہے۔
اس نے پلٹ کر کروٹ لے لی۔
اور اب وہ زمین پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہی ہے۔
زمین پر پڑا ہوا ایک تنکا اس نے اٹھا لیا ہے۔
اور اس سے ٹائل پر کچھ نقش بنا رہی ہے۔
دماغ میں خیالات ہیجان برپا کیے ہوئے ہیں۔
زیرِ لب آہستہ سے اس نے کہا :

"منور! تم کو کیا ضرورت تھی کہ صنوبر بن کر تم میری زندگی میں تہلکہ برپا کر دو۔ میں اچھی خاصی رہ رہی تھی۔ اگر خالدہ ہی تمھارے خوابوں کی ملکہ تھی تو مجھے کس خوشی میں پامال کیا۔ اف بیگم ذکی کو پتہ ہوگا تو وہ کیا کہیں گی کتنا ان کو رنج ہوگا۔"

اس نے پلٹ کر چھت کی طرف دیکھا۔
اور دل سے ہی کہنے لگی :

"ہاں غریب امیر کا جوڑ ہی کیا۔ قسمت نے کہاں لا کر
پھانسا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموش پڑے پڑے جب اکتا گئی تو وہ چمن کی طرف اٹھ کر چل
دی اور فوارے کے قریب بیٹھ کر پانی سے کھیلنے لگی۔
بے خیالی میں اس نے گنگنانا شروع کر دیا۔
اس کے تصوّر میں ایبٹ آباد کا نظارہ تھا۔
گنگناتے گنگناتے آواز قدرے اونچی ہو گئی :

غزل :

" آئی ہے یوں بھی فصلِ بہاراں کبھی کبھی
ہر گل ہوا ہے چاک گریباں کبھی کبھی

کیا پوچھتے ہو بزمِ تصوّر کی رونقیں
فردوس بن گیا ہے بیاباں کبھی کبھی

گزرے ہیں ایسے دَور بھی دنیائے ہوش پر
ہونا پڑا جنوں کو نگہباں کبھی کبھی

آئے ہیں سامنے تو یہ کہتا ہے رنگِ رخ
جیسے ہوئے ہیں وہ بھی پشیماں کبھی کبھی

ناکامیٔ حیات کی لذت نہ پوچھیے
خوں رو دیے ہیں دیدۂ گریاں کبھی کبھی

ان کے رُخ و جبیں کے تصوّر میں کھو کے نوؔر
ہم بھی رہے ہیں دل میں پریشاں کبھی کبھی

فوّارے کے حوض میں وہ پاؤں ہلا رہی تھی۔

اس کا عکس حوض میں پڑ رہا تھا جو بار بار پیر ہلانے کی وجہ سے بار بار ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھی اور چمن میں ٹہلتی ہوئی پھولوں کو شاخوں میں سے توڑ توڑ کر پتیاں نوچنے لگی۔

وہ آخری شعر کو گاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی ہی تھی کہ راہ میں منور سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔

اس نے ایک بے ساختہ نظر منوّر پر ڈالی۔

اور دوسری طرف چہرہ کر لیا۔

منور نے ہنس کر آواز دی :

"خالدہ تم کہاں ہو چلو دیر ہو رہی ہے۔"

اتوار کا دن تھا۔

آج منوّر کے کہنے پر بیگم سعادت نے راحت اور اس کی بیوی اور والدہ کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔

دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے کہ راحت مع خاندان کے آ گیا۔

سعادت اور بیگم سعادت ڈرائنگ روم میں ان سب کی منتظر تھیں۔

راحت کی والدہ اور مہر آگے آگے ان کے پیچھے راحت اور نظیر کمرے میں گھسے۔

منور ان لوگوں کے ساتھ ساتھ تھا۔

اس نے ماں سے سب کا تعارف کرایا۔

خالدہ بھی آج دوپہر کے کھانے پر مدعو تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہوئی

ریکارڈ پلیئر پر ریکارڈ لگا رہی تھی۔
بیگم سعادت نے مہر سے کہا :
"تو تم تین بہنیں ہو اور ایک بھائی۔"
مہر نے جواب دیا :
"جی ہاں ویسے تو ہم تین بہنیں ہیں۔ نظیر ہمارا بھائی ہی سمجھیے۔"
بیگم سعادت نے پوچھا :
"کیوں کیا سگا بھائی نہیں ہے؟"
راحت نے جواب دیا :
"جی ان کے والد نے نظیر کو گود لے لیا ہے ان کی والدہ کو لڑکے کا بہت ارمان تھا۔"
بیگم سعادت بولیں :
"اے تو تمھارے پاس پھر کیوں بھیج دیا؟"
راحت کی والدہ نے جواب دیا :
"یہ تو راحت کی خوشی تھی کہ سالے کو میں پڑھاؤں گا۔"
سامنے سے خدیجہ بیگم اور نورنگ آتی نظر آئیں۔
راحت اور منور کھڑے ہو گئے۔
اور راحت نے دونوں کا تعارف اپنی ماں اور بیوی سے کرایا۔
دفعتاً خدیجہ بیگم کی نظر نظیر پر پڑی۔
اور وہ چیخ مار کر اس کی طرف دوڑیں اور
"ہائے میرا بیٹا ....."
کہہ کر اس سے لپٹ گئیں۔

سعادت صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔
اور بہن کو تسلّی دینے لگے :
" خدا کا شکر کرو کہ دونوں بچّے مل گئے۔"
سب لوگ گھبرا کر دیکھنے لگے۔
نورنگ نے اٹھ کر ماں کو جدا کیا جو زاروقطار رو رہی تھیں اور بھائی کو پیار کرنے لگی۔
نظیر بھی بہن سے لپٹ گیا۔
خدیجہ بیگم اللہ کے شکرانے ادا کر رہی تھیں۔
سعادت صاحب کو بے حد خوشی تھی وہ اپنی بہن کی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔

راحت سے بولے :
" راحت یہ بچّہ ان کو کہاں ملا ؟"
راحت نے جواب دیا :
" چچا جان کسی کیمپ سے حاصل کیا تھا۔ یہ وہاں لاہور میں غلط صحبت میں پڑا جا رہا تھا تو ان کی اجازت سے میں اس کو لے آیا۔"
اندر آکر ملازم رزاق نے اطلاع دی کہ :
" ذکی صاحب اور بیگم ذکی ملنے آئے ہیں۔"
اور اس کے پیچھے ہی پیچھے شہناز، بیگم ذکی، ذکی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔
منور نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔
تو بیگم ذکی نے تعجّب سے اس کی طرف دیکھا ۔۔۔۔ اور پھر ان کو

یاد آیا کہ :

"صنوبر نے بتایا تھا کہ وہ سعادت صاحب کا نوکر ہے۔"

لیکن بیگم سعادت بولیں :

"بہن میرے بیٹے منور سے تو آپ ملیں ..... یہ پاکستان آرمی میں کیپٹن ہے اور چھٹی پر آیا ہوا ہے۔"

بیگم ذکی نے پوچھا :

"آپ کا بیٹا منوّر ؟"

وہ حیرت سے منور کو دیکھنے لگیں۔

منور خاموش تھا۔

راحت بول اٹھا :

"جی منور یا صنوبر..... جو آپ کا دل ہو سمجھیں۔"

بیگم ذکی نے اب راحت کو بھی دیکھا۔

اور تعجّب سے بولیں :

"اوہ آپ بھی ہیں.... تو صنوبر اور منوّر ایک ہی ہیں..... مگر یہ سب کیا ہے ؟"

راحت نے کہا :

"یہ اس منور سے پوچھیے..... جو آپ کے لیے صنوبر.... اور خالہ جان کے لیے منور بنا ہوا ہے۔"

خالدہ اٹھ کر آگے آگئی - اس نے پے درپے واقعات کے تحت ریڈیو گرام بند کر دیا تھا۔

اور سوالیہ نظروں سے منوّر کو دیکھنے لگی۔

منور بیگم ذکی کے سامنے آکر بولا :

"راحت سچ کہہ رہا ہے - میں ہی صنوبر ہوں"

بیگم سعادت نے پوچھا :

" آخر بات کیا ہے ؟"

سعادت صاحب بھی بولے :

" بھئی قصہ کیا ہے ...... کیسا صنوبر ؟.... ہم تو پہلی بار یہ سب سن رہے ہیں -"

بیگم ذکی اتنے روز سے سخت پریشان تھیں - ان کو صنوبر مل ہی نہیں رہا تھا آج وہ یہ سوچ کر آئی تھیں کہ وہ سارا قصہ خدیجہ بیگم سے خود کہہ دیں گی - اسی وجہ سے وہ شہناز اور ذکی صاحب کو بھی ہمراہ لائی تھیں -

اور جب یہاں آئیں -

تو عجیب حالات سے واسطہ پڑا -

انھوں نے خدیجہ بیگم کو جو اب تک رو رہی تھیں - کھینچ کر اپنے قریب بٹھا لیا -

اور کہنے لگیں :

" بہن ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے آپ کے سامنے سرخ رُو کرایا - ..... بہن ! آپ کا یہ منوّر میرے گھر اپنے دوست راحت کے ساتھ گیا اور اس نے اپنا نام صنوبر خان بتایا اور یہ بھی بتایا کہ میں سعادت صاحب کی فیکٹری میں وزیر آباد میں ملازم ہوں .... اور نور نگ

سے شادی کا پیغام دیا..... میں نے سوچا جوان لڑکی ہے اور لڑکا بھی شریف ہے اس لیے نکاح کر دیا..... اور..... رخصتی آئندہ ہونا طے پایا..... اب جب نورنگ آپ کی بیٹی نکلی تو میں سہم گئی..... کہ خدایا اب بتاتی ہوں تو یہ لوگ کہیں گے کہ دو سو روپیہ کے ہمارے ہی ملازم سے ہماری بیٹی کا نکاح کر دیا..... میں صنوبر کا انتظار کرتی رہی..... مگر وہ نہ آنا تھا نہ آیا.....
آج یہ سوچ کر آئی تھی کہ آپ سے خود ہی سب کچھ کہہ دوں گی۔"

ذکی صاحب نے سعادت صاحب سے کہا :

"ہماری نیت اچھی تھی..... خدا نے لاج رکھ لی..... منوّر آپ ہی کا بیٹا تھا۔"

بیگم سعادت نے منور سے پوچھا :

"منور ! یہ سب کیا ہے ؟"

منور نے سر جھکا کر جواب دیا :

"جی امّی جان یہ سب صحیح ہے۔"

ذکی صاحب اپنی جگہ سے اٹھے۔

نورنگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اور انھوں نے دوسرے ہاتھ سے منور کا ہاتھ پکڑا - اور نورنگ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولے :

"لو بیٹا ! اپنی امانت سنبھالو.... تم نے کہا تھا کہ گھر کا انتظام کرلوں تو رخصت کر کے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

منوّر نے نورنگ کی طرف شرارت سے دیکھا۔

اس نے شرما کر گردن اور بھی جھکالی۔

تو منور آہستہ سے بولا :

"ہے نا دیہاتی لڑکی..... کیا جانے شہر کی تہذیب۔"

اور پھر اس نے خالدہ کی طرف طنز بھری نگاہوں سے دیکھا جو پہلے ہی بڑی خونخوار نظروں سے اس کی اور نورنگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بیگم سعادت نڈھال سی ہو کے رہ گئیں۔

انھوں نے مجروح نظر سے سعادت صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کے مال دار بہو بیاہ لانے کے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔

سعادت صاحب نے بھی اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔

دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔

اور سعادت صاحب مسکرا کر بولے :

"کیا ہوا بیگم.... گھبرانے کی کیا بات ہے.... مخمل میں مخمل کا پیوند ہی تو لگتا ہے۔ نورنگ آخر اپنی ہی تو بچّی ہے۔"

خدیجہ بیگم خوش ہو کر اٹھیں ۔
اور منور کی بلائیں لینے لگیں ۔
راحت بولا :

" پھوپھی اماں ہم بھی تو ادھر بیٹھے ہیں .... ہماری آج ملازمت ہو گئی ہے ..... یہ اسلام آباد سے تار آیا ہے ۔"

خالدہ اکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔
اور غصے میں بولی :
" میں کباب میں ہڈی کیوں بنوں ۔"
اور غصے سے پیر پٹکتی ہوئی کمرے سے نکل کر چل دی ۔

ادبی معاشرتی ناول

انگار : عابدی جعفر صفحات : ۳۲۸
عشق و محبت کی دلآویز اور رنگین داستان کا نفسیاتی تجزیہ ۷/-

دیدۂ تر : عابدی جعفر صفحات : ۳۹۲
سماج کے تنگ نظر معاشرے کے لیے ایک سبق آموز ناول ۸/-

دیوار : عابدی جعفر صفحات : ۳۵۲
سماج کی بنتی اور سنورتی اقدار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ۷/۵۰

ساحل سے پہلے : عابدی جعفر صفحات : ۳۶۰
ایک رومان انگیز اور ولولہ خیز داستان ۷/۵۰

محبت کے سوا : عابدی جعفر صفحات : ۳۸۴
عشق و محبت کی طویل داستان کا نفسیاتی جائزہ ۸/-

مہیب سائے : عابدی جعفر صفحات : ۳۵۲
تحلیلِ نفسی کی کہانی عورت کی اپنی زبانی ۸/-

ہمزاد : عابدی جعفر صفحات : ۴۰۰
رومان انگیز داستان کا نفسیاتی تجزیہ ۸/-

الحمیرا : محمد سعید صفحات : ۳۳۶
عشق و محبت کی ایک دلچسپ اور دل فریب داستان ۷/۵۰

ممتاز محل : محمد سعید صفحات : ۳۸۸
معاشرہ کی بگڑی ہوئی روش پر ایک تازیانہ ۸/-

پُل صراط : سعیدہ مظہر صفحات : ۳۸۴
بھٹکتی ہوئی زندگیوں کے لیے مشعلِ راہ ۸/-

شیریں : سعیدہ مظہر صفحات : ۳۵۰
عورت کے تعصب کی روداد ایک اچھوتے اور انوکھے انداز میں ۸/-

نئی صبح : سعیدہ مظہر صفحات : ۳۵۰
زندگی کے حسین نشیب و فراز کی مکمل تصویر ۸/-

بیتاب : عذرا جمال صفحات : ۴۶۴
لکھنو کی دوشیزہ شوکت آرا کی عبرت انگیز داستان ۱۰/-

رسوائی : عذرا جمال صفحات : ۴۳۲
عجیب و غریب ناول جو خود رسوا ہو کر رہا ۹/-

مارِ آستین : عذرا جمال صفحات : ۵۱۲
ایک دوست نما دشمن کی عبرت ناک کہانی ۱۰/-

یزدانی : عذرا جمال صفحات : ۳۹۸
ایک مصور کی دلچسپ اور حسین و جمیل داستان ۸/-

پشیمانی : عذرا جمال صفحات : ۴۳۲
عشق و محبت کی رومان انگیز داستانیں۔ پیرایۂ انداز نہایت دل کش ۹/-

چور بازار : ابراہیم جلیس صفحات : ۲۷۲
زندگی کی بھاگ دوڑ میں معاشرے کی ٹکر ۶/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور، حیدرآباد، کراچی